فہرست

لمعات

کیا یورپ کو قرآن کی ضرورت ہے؟	ادارہ	3
مطالب القرآن فی دروس الفرقان (۲۹واں پارہ)	غلام احمد پرویزؒ	6
طلوع اسلام نے کیا کیا ہے؟	سید حسن عباس رضوی	25
دعا۔۔قرآن کی روشنی میں	ادارہ	32
حضرت انسان قرآن کے آئینے میں	آصف جلیل	41
اتباعِ دین کا فطری نتیجہ	خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی	48
درود کا قرآنی مفہوم	غلام باری، مانچسٹر	53
پیش لفظ	محمد اشرف ظفر	56
نقد و نظر	محمد سلیم اختر	60

ENGLISH SECTION

SAY ALLAH NO GOD

By Abdul Rashid Samnakay 1

Anita Roddick gives £51 Million in charity

By M.M.FARHAT 3

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

کیا یورپ کو قرآن کی ضرورت ہے؟

یورپ کی کئی ایک رفاہی مملکتوں (Welfare States) کے تذکرے سننے میں آتے ہیں۔۔۔ مثلاً انگلستان کی مملکت۔۔۔ کہ وہاں کوئی شخص بھوکا نہیں سوتا۔ کوئی شخص ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ ہر ایک کے لئے روزگار مہیا کیا جاتا ہے۔ بیکاروں کو الاؤنس ملتا ہے' بوڑھوں کو پنشن ملتی ہے۔ بیماروں کا علاج مفت ہوتا ہے۔ بچوں کی تعلیم مفت ہے۔ بے گھر لوگوں کو نہایت آسان قسطوں پر مکانات بنوا کر دیئے جاتے ہیں اور اس قسم کی سہولتیں صرف ان کی اپنی قوم کے افراد تک محدود نہیں بلکہ جو دوسرے لوگ بھی وہاں جا کر بسنے لگ جائیں۔ وہ بھی ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوگ اس قسم کے نظامِ معاشرہ تک کس طرح پہنچے' ان کے سامنے تو قرآن کی تعلیم نہیں تھی اور مذہب کی جو تعلیم ان کے سامنے تھی اس میں ''دنیاوی زندگی'' سے متعلق باتوں کا کوئی حصہ ہی نہ تھا۔ اسکے ساتھ ہی یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان لوگوں کو اس کے بعد بھی قرآنی تعلیم کی ضرورت رہے گی۔ اگر رہے گی تو کس کمی کو پورا کرنے کے لئے۔

پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ مفروضہ صحیح نہیں کہ ان لوگوں کے سامنے قرآن کریم کی تعلیم نہیں تھی۔ یہ لوگ صدیوں سے قرآن کی تعلیم سے آشنا ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کے مذہب پرست متعصب طبقہ نے ان کے سامنے اسلام کی بڑی رنگ آمیز تصویر پیش کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہاں ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جنہوں نے قرآن کی تعلیم کا اپنے طور پر مطالعہ کیا ہے اور صاف وشفاف نہ سہی تو کم از کم اس کے اصولوں کا دھندلا سا تصور ان کے سامنے ضرور ہے۔

لیکن جہاں یہ صورت نہ ہو وہاں عقل کا تجرباتی طریق کار فرما ہوتا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے ہم ''خدا کے کائناتی قانون'' کی اصطلاح سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔ اسی کو زمانے کا تقاضا بھی کہا جاتا ہے۔ آپ یورپ کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ جب سے اس کا مسلمانوں سے میل جول شروع ہوا (خواہ وہ صلیبی جنگوں کے میدانوں میں تھا یا اندلس کی فکرگاہوں میں) افراد کے حقوق کا تصور ان کے سامنے آیا۔ اگر وہ قرآنی وحی پر ایمان لاتے تو ان حقوق کو بلا توقف وتاخیر عمل میں لے آتے

انہوں نے ایسا نہ کیا اور عقل کے تجرباتی طریق کو اپنا راہنما بنایا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں اپنے موجودہ مقام تک پہنچنے میں کئی صدیاں لگ گئیں۔ یہ جو ہم ان کے ہاں افراد کے حقوق کا نقشہ دیکھتے ہیں وہ اسی کا نتیجہ ہے۔

لیکن انہیں اب بھی وحی کی راہنمائی کی ضرورت ہے اور اسکے بعد بھی ضرورت رہے گی۔ ان کے ہاں افراد کے حقوق کا جذبۂ محرکہ نیشنلزم ہے۔ انسانیت کا تصور نہیں ہے۔ یورپ اور امریکہ کی مختلف اقوام' اپنی اپنی قوم کو زیادہ سے زیادہ خوش حالیاں اور فارغ البالیاں پہنچانے کی فکر میں رہتی ہیں۔ اپنی قوم سے باہر کے انسانوں کا سلب و نہب (Exploitation) ان کے نزدیک نہ صرف جائز بلکہ واجب قرار پاتا ہے۔ اس کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب ان کی قوم کے کسی مفاد کا تصادم کسی غیر قوم کے مفاد سے ہوتا ہو۔ اس وقت دیکھئے کہ وہ قوم انسانیت کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر' کس طرح درندوں کی طرح مخالف قوم پر جھپٹتی ہے۔ آپ انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک اور دوسری طرف افریقی اقوام پر نگاہ ڈالئے اور پھر دیکھئے کہ وہی اقوام یورپ اور امریکہ جو عام حالات میں اس قدر مہذب اور شریف نظر آتی ہیں' اس وقت کیا بن کر سامنے آتی ہیں جب ان کا اپنا مفاد' ان اقوام کے مفاد سے ٹکراتا ہو۔ انسانیت کا تصور تو بڑی چیز ہے' وہ اس وقت عام معاشرتی اصول و آداب تک کو بھی خیر باد کہہ دیتی ہیں اور ایسے ایسے حربے استعمال کرتی ہیں جن پر عظمتِ انسانیت ماتم کرے اور احترامِ آدمیت خون کے آنسو بہائے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انگلستان یا سکنڈے نیوین ممالک یا کینیڈا وغیرہ میں بسنے والے پاکستانیوں کو وہاں دوائی مفت مل جاتی ہے۔ (بشرطیکہ وہ وہاں کی انشورنس کی فیس ادا کرتا ہو) لیکن آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ اسی پاکستان کے غریب اور مفلوک الحال انسانوں کی محنت کی کمائی کا کس قدر عظیم حصہ دوائیوں کی قیمت کے طور پر ہر سال انگلستان اور امریکہ جا پہنچتا ہے۔ وہ یہاں کے غریبوں کی خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیتے ہیں تاکہ ان کی اپنی قوم کے افراد کے چہروں کی سرخی میں فرق نہ آنے پائے اور اس میں سے دو چار بوندیں وہاں کے مقیم پاکستانیوں کو بھی دے دیتے ہیں تاکہ انہیں انسانیت کا ہمدرد اور غیروں کا بہی خواہ سمجھا جائے۔

اقوام مغرب کو اپنی اپنی قوم کے افراد کے حقوق کے تصور تک پہنچنے میں صدیاں لگ گئیں اور اس دوران میں جو کچھ ان اقوام پر گذری اس پر ان کی تاریخ شاہد ہے۔ اب اگر انہوں نے احترامِ آدمیت اور وحدتِ انسانیت کی منزل تک پہنچنے کے لئے عقل کے تجرباتی طریق ہی کو اپنا امام قرار دیا تو نہ معلوم اس مقصود تک پہنچنے میں انہیں کتنی صدیاں اور لگ جائیں اور اس عرصے میں انسانیت کو جن تباہیوں سے دوچار ہونا پڑے' اس کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ پہلے زمانے میں تو پھر بھی انسانوں کو شمشیر و سناں سے ہلاک کیا جاتا تھا لیکن اب سائنٹفک ایجادات نے انسانوں کی تباہی کے لئے ایسے اسباب و

ذرائع وضع کر لئے ہیں کہ دنیا کے اکثر مفکر اس خیال سے لرزاں و ترساں ہیں کہ اگر تیسری عالمگیر جنگ چھڑ گئی تو دنیا میں انسانوں کا وجود تک باقی نہیں رہے گا۔ اندریں حالات' اب انسانیت اسے Afford ہی نہیں کر سکتی کہ دنیا عقل کے تجرباتی طریق کی سست رفتاری سے وحدتِ انسانیت کی منزل تک پہنچے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اقوام مغرب کو قرآن کی تعلیم سے روشناس کرایا جائے تاکہ وہ وحی کی راہنمائی میں اس منزل تک جلد از جلد پہنچ سکے اور عالمگیر انسانیت اس تباہی سے بچ جائے جو بصورتِ دیگر اس کی تقدیرِ مبرم نظر آتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(دوسرا باب)

سورۃ الملک

(آیات 5 تا 6)

خوانندگانِ محترم! جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ پرویز صاحب علیہ الرحمہ کے دروسِ قرآن کی تسوید و اشاعت کا سلسلہ تقریباً سات سال سے جاری و ساری ہے۔ اس سلسلے کا سب سے پہلا درس اگست 2000ء میں ماہنامہ طلوع اسلام میں شائع ہوا تھا۔ قارئینِ کرام کی دلچسپی اور حوصلہ افزائی سے یہ دروس گاہے گاہے ماہنامہ طلوع اسلام میں بھی چھپتے رہے اور بعد ازاں کتابی صورت میں بھی مسلسل آپ تک پہنچ رہے ہیں۔ آپ سے ایک بار پھر استدعا کی جاتی ہے کہ آپ ہمیں اس سے متعلق اپنی رائے لکھ کر بھیجئے کہ اس کام کو اسی نہج پر جاری رکھا جائے اور ماہنامہ طلوع اسلام میں بھی شائع کیا جائے۔ آپ کے ذہن میں اگر کوئی تجویز ہو تو وہ بھی ادارہ طلوع اسلام کے پتہ پر لکھ بھیجئے تاکہ آپ کے فیڈ بیک سے ہم استفادہ کر سکیں۔ شکریہ

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1983ء کی 7 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الملک کی آیت 5 سے ہو رہا ہے: (67:5)۔

قرآنِ کریم کا حقائق کو بیان کرنے کا محاکاتی انداز

آپ کو یاد ہوگا پچھلے درس میں، اس سورۃ کی ابتدائی چار آیتوں میں، عروسِ فطرت کی رعنائیوں اور زیبائیوں اور کارگہ کائنات کے حسنِ نظم و نسق کی ندرت کاریوں کا بیان بڑے ہی محاکاتی انداز میں ہوا تھا۔ پانچویں آیت کی ابتداء بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ کہا یہ ہے کہ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُومًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ (67:5) [1] یہاں بات تو وہی حسنِ کائنات کی ایک اگلی کڑی کی ہے لیکن وہ تو باتوں ہی باتوں میں، لفظوں ہی لفظوں میں، ایسے حقائق بیان کر جاتا ہے کہ عقل محوِ حیرت رہ جاتی ہے۔ یہاں کہا یہ ہے کہ ہم نے السَّمَاءَ الدُّنْيَا میں جگمگاتے تارے تمہارے لیے رکھ دیئے ہیں۔ پہلے یہ دیکھیے کہ السَّمَآءَ الدُّنْيَا تیرہ سو سال پیشتر کون کہہ سکتا تھا۔ یہ جو تم سے قریب ترین فضا ہے، اس میں جگمگاتے ہوئے چراغ تمہیں نظر آتے ہیں، تو گویا قریب ترین فضا کہنے سے بات واضح کر دی کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ یہ قریب تر فضا ہے، بعید تر فضائیں تو پتہ نہیں کتنی ہیں۔ قرآن ایک لفظ السَّمَاءَ الدُّنْيَا سے افلاکیات کے اتنے حقائق بیان کر گیا کہ آج جیمز جینز (James Jeans) ان کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے، ورنہ اس دور میں تو سوال ہی نہیں تھا کہ کوئی السَّمَاءَ الدُّنْيَا کہتا یا اس کے بعد اس کے بعید تریں سماء کا کوئی

---

[1] اور ہم نے اس فضا کو جو تمہیں قریب تر نظر آ رہی ہے، درخشاں ستاروں سے مزین کر رکھا ہے۔ (یہ بھی تمہاری زمین کی طرح مختلف اجرام ہیں لیکن) جو لوگ ہمارے قوانین کا علم نہیں رکھتے اور توہمات کی تاریکیوں میں زندگی بسر کرتے ہیں وہ ان ستاروں سے قیاس آرائیاں کر کے غیب کے حالات معلوم کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اب نزولِ قرآن کے بعد علم و تحقیق کا دور آ گیا ہے تو یہ کاہن اور نجومی رفتہ رفتہ ختم ہو جائیں گے۔ ان کی اٹکلیں بے کار ہو کر رہ جائیں گی اور ان کا انجام بڑا ہلاکت انگیز ہوگا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ذکر کرتا۔ تو پہلی چیز تو یہی ہے کہ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کے الفاظ سے یونہی آگے نہیں گزر جانا چاہیے۔ وہ تو حقائق کی ایک دنیا اپنے اندر لیے ہوئے ہوتا ہے۔ پھر مصابیح کہا یعنی یہ جو کرّے ہیں' یہ جو تارے ہمیں نظر آتے ہیں' یہ سارے کرّے ہیں۔

میں نے پہلے بھی یہ عرض کیا تھا کہ یہ بھی اس کی بڑی رحمت یعنی ربوبیت ہے کہ اس نے ان کرّوں کو اس انداز سے یہاں رکھا ہے کہ وہ ہمیں حسین تارے نظر آتے ہیں' جگمگاتے ہوئے کتنے خوبصورت ہوتے ہیں۔ اگر کہیں وہ ان کے اوپر پڑے ہوئے نقاب کو اٹھا دیتا اور وہ اپنی اصلی شکل میں ہمارے سامنے آتے تو رات کو کوئی سو نہ سکتا۔ آج ہمارے زمانے میں ایک چاند ہی کا نقاب اٹھا ہے تو دیکھیے کیا صورت نظر آئی ہے۔ عزیزانِ من! چاند کے حسن و زیبائش کی داستانیں زمانہ قبل از تاریخ سے انسان کے سامنے آتی رہیں۔ شاعروں کے ہاں' ادیبوں کے ہاں' وہ ایک حسین ترین مجسمہ تھا۔ بچوں کے لیے وہ بھی چندا ماموں تھا اور یہ اتنا حسین اپنی کشش اور رعنائی کی بناء پہ تھا۔ ہر چیز جسے آپ Lunatic کہتے ہیں' وہ لفظ Lunar سے ہی تو ہے یعنی دیوانگی پیدا کر دینے والا حسن۔ جنون پیدا کر دینے والا حسن' وہ ایسا مہوت نظر آتا تھا اور جب خلانوردوں نے اس کے چہرے پہ پڑے ہوئے نقاب کو اٹھایا تو نیچے سے یہ اتنا بھیانک' ویرانہ نظر آتا ہے کہ اس سے ڈر آجاتا ہے۔ تو یہ تو اس کی کرامت اور ربوبیت تھی کہ اس نے ان ستاروں کو ہمارے سامنے بے نقاب نہیں کیا۔ اس لیے ہمارے ہاں وہ حسین سماء ہی نظر آتا ہے۔ کتنا کرم ہے اس کا کہ بعض حقائق کو چھپانا بھی ہمارے لیے رحمت بن جاتا ہے۔

عزیزانِ من! ''بمصابیح'' کے ایک لفظ نے بتا دیا کہ یہ ایسے نظر آتے ہیں جیسے کہ چمکتے ہوئے چراغ ہوں۔ درحقیقت یہ اس سے الگ ایک اور چیز ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر آج کے پورے درس میں ہی وہ چیز آجائے تو غنیمت ہوگا۔ قرآن کریم نے کہا کہ جَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ (67:5)۔ اس آیت کے مفہوم کے لیے تو بہت بڑی تمہید کی ضرورت ہے۔ بہرحال یہ جو کائنات ہمارے سامنے ہے اس کے اندر انسان کو اس نے ایک ایسی خصوصیت عطا کی ہے جو کائنات میں کسی اور شے کو حاصل نہیں ہے۔ اور وہ ہے اس کا اختیار و ارادہ۔ یہ خالصتاً خدا کی خصوصیت ہے۔ اسے اس نے روح یا توانائی کہا ہے۔ یہ اس کے لیے مخصوص تھی' کسی اور کا اس میں حصہ نہیں تھا۔ انسان کے متعلق اس نے یہ کہا ہے کہ فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا (21:91) اپنی توانائی کا ایک شمہ انسان کو بھی دیدیا۔ خدا تعالیٰ کا اختیار و ارادہ تو لامحدود ہے لیکن اس نے انسان کو ایک محدود حد تک ہی سہی' اختیار اور ارادے کی نعمت سے نوازا' جو ایک بہت بڑا شرف ہے۔ یہ چھوٹے سے پیمانے پر خدائی کرنے والی بات ہے اور مخلوق میں سے کسی اور کو یہ شرف حاصل نہیں ہے۔ اور پھر وہ تو خدا ہے جو بڑا وسیع الظرف ہے۔ اختیار و ارادہ عطا کیا ہے تو وہ اسے واپس نہیں لیتا' یہی بات نہیں کہ وہ اسے چھینتا نہیں ہے' وہ انسانوں کے معاملات میں دخل بھی نہیں دیتا۔ خدا Absolute Power' اقتدارِ مطلق کا مالک ہے۔ اس کا یہ اختیار و ارادہ جو انسان کو دیا ہے خود

خدا کا عطا کردہ ہے لیکن جب ایک دفعہ دیا ہے تو پھر نہ چھینتا ہے اور نہ ہی اس میں دخل دیتا ہے۔

عزیزانِ من! قرآن کے مقامات کو دیکھیے۔ اس کی جو اپنی دنیا ہے اس میں تو یہ ہے کہ وہ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ (3:40) ہے۔ وہ اپنی مشیت کے مطابق جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ ٹھیک ہے قادرِ مطلق ہے' اس کی مشیت لامحدود اختیارات پر مبنی ہے۔ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ یہ مَا یَشَاءُ (3:40) ہے لیکن جب انسانوں کی دنیا کی طرف آتا ہے تو وہاں وہی مادہ ہے' وہی لفظ ہے۔ غور کیجیے اس نے وہاں اسے ''یشاء'' ہی کہا ہے۔ ان سے کہتا ہے کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (41:40)۔ اپنی دنیا میں تمہاری مشیت چلے گی' ہماری دنیا میں ہماری مشیت چلے گی۔ تم جو جی میں آئے کرو ہم دخل نہیں دیں گے۔ یہ شِئْتُمْ ہے۔ اُدھر اپنے لیے مَا یَشَاءُ (3:40) ہے۔ یہ کتنی بڑی چیز ہے جو کہی ہے: اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ [1] (41:40)۔ یہ الگ بات ہے کہ جو کچھ تم کرو گے اس کے نتائج بھی تمہیں بھگتنے پڑیں گے لیکن اپنی دنیا میں تم صاحبِ اختیار ہو۔ یہی اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ [1] ہے۔

عزیزانِ من! وحی کے ذریعے کچھ قوانین دیئے' کچھ ہدایات دیں۔ وہ درحقیقت ہدایات ہی ہیں جنہیں ہم قوانین کہتے ہیں۔ یہ Guidence ہے' راہنمائی ہے۔ اس راہنمائی کے متعلق بھی یہ کہا کہ یہ تو تمہیں ہم نے بتا دیا ہے کہ سنکھیا ہلاکت پیدا کرتا ہے اور پانی زندگی بخش ہے' یہ صحیح راستہ ہے' یہ غلط راستہ ہے۔ یہ ہم نے بتا دیا ہے۔ تمہیں مجبور نہیں پیدا کیا کہ ضرور یہ راستہ ہے اس پہ چلو۔ صرف ہدایت دی اور ہدایت دینے کے بعد کہا کہ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْیَکْفُرْ [2] (18:29)۔ ہدایت ہم نے دیدی' جس کا جی چاہے صحیح راستہ اختیار کرے' جس کا جی چاہے غلط راستہ اختیار کرے۔ یہاں پھر وہی ''شآء'' آیا ہے۔ اس کی مشیت کی دنیا اس کا جہان ہے' انسانی دنیا میں اس کی یہ کیفیت ہے۔ تو یہ سب سے بڑی خصوصیت انسان کے لیے ہے جو اُدھر خدا کو حاصل ہے اور نیچے انسان کو حاصل ہے۔

انسان کے اختیار و ارادہ کو سلب کرنا خلافِ قرآن ہے

عزیزانِ من! اس چیز کے بعد قرآن کے اس اصول کو سامنے رکھیے کہ کوئی عقیدہ' کوئی مسلک' کوئی مذہب' کوئی نظام' جو انسان

---

[1] جو کچھ تمہارے جی میں آئے کرو۔ (جونسی روش جی میں آئے اختیار کرلو' تم پر کوئی زبردستی نہیں۔ بس اتنا سمجھ لو کہ) اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (41:40) خدا کا قانونِ مکافات تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ تم جونسی روش اختیار کرو گے اس کے مطابق نتیجہ مرتب ہو جائے گا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] جس کا جی چاہے اس پر ایمان لے آئے' اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ (ایضاً)

کے اس اختیار وارادے کی حد میں حائل ہو یا کوئی اسے سلب کرے تو وہ خلافِ قرآن ہے۔قرآن نے آتے ہی پہلے مذاہب عالم کو لیا اوران کے ہاں جو عقائد تھے جس سے انسان کا اختیار وارادہ سلب ہوتا تھا' کہا کہ قرآن ان کے خلاف چیلنج ہے۔قرآنِ کریم نے اعلانیہ اِن کی تردید کی۔

دنیائے انسانیت میں یہودیوں کا عقیدہ

یہودیوں کے ہاں یہ عقیدہ تھا کہ جو بچہ بنی اسرائیل کے ہاں پیدا ہوا سی کو نجات ملے گی اور محض بنی اسرائیل کا بچہ ہونے کی جہت سے وہ جنت میں چلا جائے گا۔غیر از بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والا کوئی بچہ' کوئی انسان' جنت میں نہیں جا سکتا۔تو اب یہ بات کہ کوئی بچہ بنی اسرائیل کے ہاں پیدا ہوتا ہے اور کوئی دوسری نسلوں میں پیدا ہوتا ہے تو یہ تو اس بچے کے اپنے اختیار میں ہی نہیں ہے۔اِس نے تو پیدائش سے ہی اختیار وارادہ سلب کر دیا اور پھر جو بنی اسرائیل کے ہاں پیدا ہو گیا وہ غیر بنی اسرائیل نہیں بن سکتا اور جو غیر بنی اسرائیل کے ہاں پیدا ہو گیا وہ بنی اسرائیل کا نہیں بن سکتا۔یہ تو قاطبۃً بن گیا یعنی اس کی قسمت میں پہلے سے ہی لکھا ہوا بن گیا۔اس نے یہ بات سلب کر لی' لہٰذا قرآن نے اس کی کھٹ [1] سے تردید کر دی کہ یہ جو تم کہتے ہو بالکل غلط ہے۔عزیزانِ من! میں یہ مختصر الفاظ میں بیان کرونگا کیونکہ اس میں تفصیلی باتیں تو پہلے آ چکی ہیں۔عیسائیت کی دنیا کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ' اپنی پیدائش کے ساتھ' اپنے اولیں ماں باپ کے گناہ کا بوجھ اپنی پشت پر لادے آتا ہے اور اس کا کوئی عمل اس بوجھ کو اتار نہیں سکتا بجز اس کے کہ وہ حضرتِ مسیحؑ کے کفارے پر ایمان لائے۔تو گویا پہلی چیز تو یہ ہوگئی کہ بغیر اپنی کسی ذمہ داری کے' بغیر اپنے کسی اختیار وارادے کے' چوائس کے' ہر انسانی بچہ گناہ کا بوجھ لاتا ہے۔وہ تو پیدا ہونے کے ساتھ ہی جیسے ہاتھ منہ کان ناک اللہ کی طرف سے ملے' اسی طرح گناہ کا ایک پٹارہ بھی اس کی پیٹھ کے اوپر رکھ دیا اور پھر اگلی چیز یہ کہ وہ اسے اتار ہی نہیں سکتا' جو جی میں آئے کر دیکھے' اس کا کوئی عقیدہ' کوئی عمل' اس گناہ کے دھبے کو دھو نہیں سکتا۔

ہندومت کی نظریاتی تعلیم میں انسانیت کی تذلیل

عزیزانِ من! ہندومت کے ہاں بھی بعینہٖ یہی چیز ہے۔انہوں نے تو انسانوں کو چار ورنوں میں تقسیم کر دیا۔جس گھر میں' جس ورَن میں' کوئی بچہ پیدا ہوا' اسی ورَن کی خصوصیات اس کے ساتھ آ گئیں: برہمنوں کے ہاں پیدا ہوا تو پوچھو ہی نہیں: بے تاج بادشاہ'

---

[1] فوراً ہی

کھشتریوں کے ہاں پیدا ہوا: حکومت ان کے ہاتھ میں ہے' ویش کے ہاں پیدا ہوا: ساری کاروباری دنیا ان کی کپٹلزم اور سوداگری اور اگر شودروں کے ہاں پیدا ہوا تو وہ ان سب کا خدمت گزار۔ جس گھر میں پیدا ہو گیا اپنے جنم کو بدل نہیں سکتا' اسے وہی کچھ رہنا ہے۔ آپ نے غور کیا۔ اس سے پیشتر' زمانہ نزولِ قرآن میں' اور آج تک بھی' یہ جتنے دنیا کے بڑے بڑے مذاہب ہیں' یہ تمام مذاہب نزولِ قران سے پیشتر بھی موجود تھے اور یہ ان کے بنیادی عقائد تھے۔ قرآن نے آ کے ان کی تردید کی ہے۔ تو یہی نہیں کہ وہ ان کے ساتھ مذہبی مناظرہ کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آدم کی' انسان کی' یہ ایک ہی خصوصیت تھی' اس کو سلب کرنے والے مذاہب خدا کے نہیں ہو سکتے۔ دلیل یہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے متعلق سورۃ اعراف میں کہا گیا کہ یہ ان تمام زنجیروں کو توڑ دے گا' جو انسانیت کو پہنائی گئی ہیں۔ یہ ان تمام سلوں کو اتار پھینکے گا جو آدمیت کے سر پر برف کے تودوں کیطرح لاد دی گئی ہیں۔ یہ انسانیت کو آزاد کر دے گا' زنجیروں کو توڑے گا کہ جو فزیکل (جسمانی) قسم کی بھی غلامی ہے وہ بھی نہیں رہے گی۔ یہ ان سلوں کو جو سر پہ ہیں اتار پھینکے گا کہ فکری طور پہ بھی کوئی غلامی باقی نہیں رہے گی۔ غور فرمائیے کہ جو بعثت نبی اکرم ﷺ کا مقصد بتایا ہے وہ یہ ہے۔ اس کے متعلق جو پہلی چیز چلی آ رہی تھی وہ یہ تھی کہ حکومت نسل کے اعتبار سے ہے تو اس نے اس پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا' ان تمام عقائد کے اوپر جو اس طرح ان مذاہب کے اندر چلے آ رہے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70) ہر انسانی بچہ' انسانی بچہ ہونے کی جہت سے' یکساں واجب التکریم ہے' اس لیے کہ اس نے ہر بچے کو پیدائش کے اعتبار سے اپنی اس توانائی کا' اپنے اس اختیار وارادے کا' حصہ دیا ہوا ہے۔

کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں

عزیزانِ من! آگے بات حکومت کی آتی تھی۔ سارا قرآن اس اصول کو لیے ہوئے ہے کہ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر حقِ حکومت حاصل نہیں ہے۔ غور فرمائیے کتنی بڑی آزادی دی ہے۔ کسی کو حکومت کا حق ہی نہیں ہے۔ نظم وضبط چلانے کے لیے خدا کی کتاب میں جو اصول اور قوانین دیئے گئے ہیں' صرف انہیں ہر ایک پہ یکساں طور پر نافذ کیا جائے گا۔ اس میں کوئی بات نہ سربراہِ مملکت کی ہے' نہ خصوصیت حکمران کی ہے۔ وہ سارے کے سارے اس کے تابع چلتے ہیں۔ وہ صرف نافذ کرنے کی ایک مشینری ہیں اور اس کے بعد انہی قوانین کے تحت انہوں نے بھی زندگی بسر کرنی ہے۔ ان کے متعلق یہ بھی کہہ دیا کہ یہ جو خدا کے احکام اور اصول ہیں جس کا جی چاہے ان کو تسلیم کرے جس کا جی چاہے اِن سے انکار کرے۔ وہ کہتا ہے کہ ملحد و بے دین ہو جاؤ' خدا کا بھی انکار کر دو' کیونکہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (2:256) کسی قسم کا جبر نہیں ہے۔ جبر آیا تو وہ جو انسانیت کے اختیار وارادے کی بنیادی خصوصیت تھی' وہ ختم ہو گی۔ جبر ہے ہی نہیں۔ اندازہ لگائیے کہ قرآن کیا لے کے آیا اور اِس کے ساتھ کیا کیا۔ اور پھر وہ جو اولیں دَور ہے اس کی جو کچھ بھی تاریخ

ہمارے ہاں ملتی ہے یا قرآن نے جو کچھ ان کے متعلق بیان کیا ہے اس میں آپ دیکھئے: وہ یہی شرفِ انسانیت ہے جس کا بار بار تذکرہ ہے۔ خود نبی اکرمؐ سے کہا کہ اپنی اس قوم سے کہدو کہ اس قرآن میں تمہارے ہی شرف کا تذکرہ ہے۔ قرآن میں تو شرفِ انسانیت کا تذکرہ ہے۔ یہ آزادی دی یعنی اختیار وارادے کی وہ خصوصیت برقرار رکھی۔ کون ہے آزادی دینے والا؟ آزادی تو خدا نے دے رکھی تھی۔ اسی لیے حضرت عمرؓ نے حضرت عمر بن عاصؓ کو، جو مصر کے گورنر تھے، ایک ذرا سی کوتاہی پر لکھا تھا کہ ابن عاص ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا، تم انہیں غلام بنانے والے کون ہوتے ہو'' آزاد جنا تھا'' کے قرآن کے وہی معنی ہیں کہ ہر انسانی بچہ پیدائش کے اعتبار سے واجب التکریم ہے۔ یہ سارا کچھ کیا۔

عزیزانِ من! اب اس نکتے پہ آجایئے گا کہ کوئی عقیدہ، کوئی عمل، کوئی نظام، جو انسان کے اختیار وارادے کی خصوصیت سلب کرتا ہے، اس کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتا ہے، وہ منشائے خداوندی کے خلاف ہے، قرآن کے خلاف ہے۔ پہلی بات یہ تھی کہ یہ نظامِ حکومت ہو کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان پہ حکومت نہ کر سکے۔ اس قوم نے پہلے ہی اسے توڑ دیا، عیسائیوں یہودیوں ہندوؤں مجوسیوں نے نہیں توڑا، اسی قوم نے توڑا جس کے ہاتھ میں یہ قرآن تھا اور جسے اس کتاب کا وارث کہہ کے پکارا گیا تھا۔ اسی نے سب سے پہلے اپنے ہاں ملوکیت رائج کی: انسانوں ہی کی حکومت دوسرے انسانوں پر۔ آپ لمبے چوڑے عقائد اور بحثوں میں نہ پڑیں۔

خدا کے احکامات کی بجائے انسانوں کے احکام

عزیزانِ من! ایک بنیاد کو لے لیجیے۔ قرآن نے انسان کو اختیار وارادے کا جو شرف دیا ہے، اس نے اسے سلب کر لیا۔ اب خدا کے احکام نافذ نہیں ہو رہے۔ یہ انسانوں کے احکام تھے۔ یہ تو ملوکیت ہے جو ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ ملوکیت جبر کا اصل سرچشمہ ہے اور نگاہوں سے اوجھل ہے۔ اسے نگاہوں سے اوجھل رکھا جاتا ہے۔ ایسا کرنے والی مذہبی پیشوائیت ہے جسے انگریزی میں تھیاکریسی کہتے ہیں۔ ذرا تاریخ کے اس نکتے پر غور کیجیے گا: نہ وہ اُمیہ (132-41ھ بمطابق 750-661ء) یا عباسیوں (656-132ھ بمطابق 1258-750ء) کی مملکتیں رہیں۔ چلی گئیں، نہ ان کی حکومتیں رہیں۔ وہ تو مدت ہوگئی ختم ہوگئیں، ناپید ہوگئیں۔ نہ وہ حکمران رہے، وہ چل بسے، نہ ان کی حکومتیں رہیں، نہ ان کے اختیارات رہے۔ یہ سب ختم ہوگئے لیکن انہوں نے مذہبی پیشوائیت سے جو قوانین بنوائے تھے وہ آج تک آپ کے سر پہ مسلط چلے آرہے ہیں۔ مثلاً انہوں نے قانون بنوایا کہ عورت کو گواہی کا حق حاصل نہیں ہے:

ہوئی لاکھ دنیا اِدھر کی اُدھر ہے
وہی سنگِ در ہے، وہی اپنا سر ہے

آج بھی آپ کے ہاں وہی قانون ہے۔ وہ شہنشاہ چلے گئے، ان کی مملکتیں چلی گئیں، ان کی حکومتیں چلی گئیں، ان کے بنائے ہوئے اپنی

دنیا کے جو قانون تھے، وہ بھی نہ رہے، مگر انہوں نے مذہب کے نام پر جو قوانین بنائے تھے آج بھی آپ انہیں چیلنج نہیں کر سکتے، ان کے خلاف ایک لفظ نہیں کہہ سکتے، ان کا بدلنا تو ایک طرف رہا ان کے خلاف بھی کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ ارتداد ہے، یہ کفر ہے، مرتد کی سزا قتل ہے۔ آپ غور فرمایئے، آپ کے ہاں کے قوانین جنہیں یہ سارے کے سارے Personal Laws (شخصی قوانین) کہتے ہیں، یہ سارے اس دَور کے انسانوں کے بنائے ہوئے Laws (قوانین) ہیں۔ یہ انہی شہنشاہوں کے زیر عاطفت بنے، جو کچھ ان کی منشاء تھی اس کے مطابق یہ سارا کچھ بنا۔ آپ کو معلوم ہے کہ سب سے بڑی فقہ حنفی ہے۔ اس کے ہاں یہ قانون ہے کہ بادشاہ یا سلطان یا جنہیں اس زمانے میں خلیفہ کہا کرتے تھے، وہ قتل کے سوا کوئی بھی جرم کرے وہ ماخوذ نہیں ہوسکتا، اس سے اس کی باز پرس نہیں ہوسکتی۔ آپ کے ہاں یہ فقہ کا قانون ہے، یہ لونڈیوں کے قوانین ہیں، عورتوں کو اس پست درجے پہ رکھنے کے قوانین ہیں، چار چار بیویاں رکھنے کے قوانین ہیں، انہیں طلاق طلاق طلاق کہہ کر سب کچھ ختم کرنے کے قوانین ہیں۔ یہ جتنے بھی اس قسم کے سارے قوانین ہیں، یہ سارا قصہ آج کی جو آپ کے ہاں وفاقی شرعی عدالت ہے، یہ قوانین اس کے دائرہ اختیار سے بھی باہر رکھے ہوئے ہیں۔

آج دو قسم کے قوانین رائج ہیں

آج بھی آپ دو قسم کے قوانین دیکھ رہے ہیں۔ کچھ تو حکومت سے متعلق ہیں، ان کے نظم و نسق سے متعلق ہیں، وہ حکومت کی طرف سے نافذ ہوتے ہیں۔ اور دوسرے وہ جن کا تعلق اُن معاملات سے ہے جسے آپ شرعی کہتے ہیں۔ وہ وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار میں ہیں۔ ان کے متعلق وہ فیصلہ کرتی ہے۔ وہ قوانین بنتے بھی اسی طرح سے ہیں۔ یہ ان کی توثیق سے بنتے ہیں۔ وہ جسے اسلام کہیں، وہ اسلام کی اس چیز سے نافذ ہوتا ہے۔ اس میں آپ کو کوئی اختیار و ارادہ نہیں۔ جب وہ کہہ دیں کہ تم نے یہ تین دفعہ طلاق کہا اور میاں بیوی میں طلاق پڑ گئی، تمہارا نکاح ٹوٹ گیا۔ اب اس کے بعد، معاذ اللہ، میری بیٹیاں بیٹھی ہیں، وہ اس سے کہیں ہیں کہ اب تمہارا میاں بیوی کا تعلق زنا ہوگا، جو اولاد ہوگی وہ ولدالزنا ہوگی۔ آپ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ دیکھیے آپ کا وہ اختیار و ارادہ کہاں گیا جو خدا نے دیا تھا۔ اس میں تو صرف کتاب اللہ کی پابندی تھی لیکن یہاں انہوں نے پابندی عائد کر دی ہے۔ آپ ان کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔ آج بھی اگر اربابِ حکومت سے کوئی آرڈیننس جاری ہوتا ہے تو اس کی اطاعت کرنا، اس کے مطابق عمل کرنا، ملک کا قانون ہے۔ اس کا اتباع لازم ہے۔ آپ اِسے Criticise کر سکتے ہیں، تنقید کر سکتے ہیں، اس کے متعلق لکھ سکتے ہیں مگر وہی چیز جب وفاقی شرعی عدالت کی رو سے نافذ ہو جائے تو آپ اس پہ تنقید بھی نہیں کر سکتے۔ آج بھی یہی آج کے فیصلے، جنہیں آپ شرعی عدالت کے فیصلے کہہ رہے ہیں، آنے والے دَور کے اندر یہی آپ کے ہاں شریعت بنے گی۔ کچھ پہلے سے بنی ہوئی چلی آ رہی ہے، کچھ اس کے اندر اضافہ ہو کے آگے بن جائے گی اور اسے کوئی چیلنج بھی نہیں کر سکے گا۔

عزیزانِ من! غور فرمایا یہ ہے آپ کے ہاں آج کا اسلام۔ میں یوں کہوں گا کہ آج کا نہیں ہے بلکہ ہزار برس کا' صدرِ اول کے بعد کے دَور کا ہے۔ وہ معاشرہ جو اس کی رو سے قائم ہوا تھا' وہ نظامِ سرمایہ داری کا تھا' نظامِ ملوکیت کا تھا' مذہبی پیشوائیت کا تھا۔ یہ تینوں نظام پہلے ہی دن سے لازم وملزوم چلے آ رہے ہیں: فرعون فرعونیت کر ہی نہیں سکتا جب تک کہ ہامان اور اس کے لشکر اس کے ساتھ نہ ہوں اور اس کی بنیاد وہ قانون ہوتا ہے' جو مذہبی پیشوائیت بناتی ہیں۔ دراصل یہ تینوں ایک ہی ہیں۔ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ یہ تینوں ایک ہی ہیں۔ اب بھوکے کے دل میں تو یہ خیال پیدا ہوگا کہ ساتھ ہی جو میری کوٹھی کے اندر مین بلڈنگ میں رہ رہا ہے جو کچھ اس کے کتوں کو نصیب ہے' میرے بچوں کو نصیب نہیں ہوتا۔ کہا: خاموش' لب پہ لانا تو ایک طرف رہا' دل میں بھی اس کے خلاف کوئی بات نہ ہو کہ یہ تقدیر ہے' خدا کی بنائی ہوئی تمہاری قسمت ہے' تمہارے ہاں لکھا ہوا ہی یہ ہے' یہ اللہ کا لکھا ہوا ہے' اس کا متعین کردہ ہے۔ آپ کے ہاں تقدیر کا ایک مسئلہ Introduce (داخل) کیا اور یہ تمام عقائد آ گئے۔ دراصل تقدیر کا یہ عقیدہ مجوسیوں کے ہاں تھا۔ وہ اس لیے کہ ایران کی شہنشاہیت تو آپ کو معلوم ہے کس انداز کی تھی۔ یہ ساری چیزیں' ملوکیت' شہنشاہیت بنواتی ہے اور یہ سارے معاملات باہمی طور پر کچھ اس طرح طے ہوتے ہیں کہ شہنشاہیت محتاج ہوتی ہے کہ انہوں نے خود اس قسم کا جو قانون بنانا ہے وہ ان سے بنوائیں تو یہ بنوا ہی لیتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا حصہ کیا ہے۔ وہ انہیں حصہ دیتے ہیں۔ وہ حصہ یہ ہے کہ تمہاری دنیا میں تمہاری بادشاہی ہوگی اور ہم اس میں دخل اندازی نہیں کریں گے اور اسی طرح ہمارا بنایا ہوا قانون' تمہارا حکمران بھی نہیں بدل سکتا۔ یہ عقیدہ تقدیر ہے کہ صاحب! اس قسم کے ظالم جابر مستبد جو انسانیت کا گلا گھونٹ رہے ہیں' خدا کی طرف سے ہیں۔ ان کے بارے میں خاموش رہو' لب کشائی بھی نہ کرو کیونکہ خدا جسے چاہتا ہے حکومت دیتا ہے' جسے چاہتا ہے چھین لیتا ہے' جس سے چاہتا ہے وہ رزق دیتا ہے' جسے چاہتا ہے بھوکا مار دیتا ہے۔

ہر چیز پہلے سے لکھی ہوئی ہے صاحب! خدا کے ہاں سے یہ فیصلے پہلے ہی ہوئے ہوتے ہیں حتیٰ کہ یہ میاں بیوی کا معاملہ بھی۔ اب ہمارے ہاں ایجاب وقبول کی رسم چلی آ رہی ہے۔ یہ بھی ایک عجیب تماشہ ہے۔ سارا کچھ تو پہلے سے ہو چکا ہوتا ہے' طے ہو گیا ہوا ہے' برات آ گئی ہے' باجے بج رہے ہیں' ڈھولکیں بج رہی ہیں' کھانے پک رہے ہیں' وہ بچیاں گا رہی ہیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور یہ سب کچھ ہو ہوانے کے بعد آخر میں ہوتا ہے کہ ''اووی تے چار کلمے والی گل وی تے کرلو تو۔'' [1] پھر وہ ماموں اور لڑکی کا چچا لڑکی کے پاس جاتے ہیں اور وہاں جا کے کہتے ہیں کہ فلاں ابنِ فلاں ابنِ فلاں تمہیں قبول ہے؟ اب اگر وہ نا قبول کے معاملے میں بھی خاموش

---

[1] وہ چار کلمے بھی تو پڑھا دو۔ وہ بات بھی تو پوری کرلو۔

رہے تو حکم یہ ہے کہ لڑکی کی جو خاموشی ہے اسے اس کی قبولیت ہی سمجھ لیجیے۔ چلو جی بات پوری ہوئی اور دوسرا یہ جو دولہا ہے یہ تو گھوڑی پہ چڑھ کے آیا ہوا ہوتا ہے۔ اس قبولیت کے لیے اس سے پوچھنے کی کیا ضرورت۔ عزیزانِ من! اس ایجاب وقبول کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ قرآن نے کہا تھا کہ ہماری آیات کا مذاق نہ اڑانا۔ یہ ہے رضامندی جو لی جارہی ہے۔ رضامندی لینے والا کون ہے؟ قرآن نے تو کہا ہے کہ میاں بیوی باہمی رضامند ہوں تو نکاح ہوتا ہے۔ یہاں تو ہمارے ہاں ولی کی اجازت کے بغیر بالغ لڑکی بھی اپنا انتخاب نہیں کرسکتی۔ بعض حالات میں اگر لڑکی نے کہیں کوئی چن بھی لیا' پھر نکاح بھی کرلیا ہے تو انہیں یعنی وارث یا جسے وہ ولی کہتے ہیں' اس کا اختیار ہے کہ وہ اس نکاح کو فسق کرسکتے ہیں۔ لڑکے اور لڑکی کا اختیار وارادہ کہاں گیا؟ وہاں سے اختیار وارادے کی یہ صورت اِدھر وارث یا ولی کے پاس آ گئی۔

طلاق طلاق طلاق اور قصہ ختم

جس نکاح کو دونوں کی رضامندی سے' بہرحال' باندھا تھا' اب اس کے توڑنے کے وقت میں وہ ایک ہی فریق ہے' سارے اختیارات اس کے ہاتھ میں ہیں۔ تین دفعہ اس نے طلاق طلاق طلاق کہی' معاملہ ختم ہوگیا۔ روتی رہو' اس کا اختیار وارادہ سلب ہوا۔ یہ نکاح کیا ہوا؟ کہا کہ اے جی! اے نکاح جیہڑے نیں' اے تے عرشاں تے بدھے رہندے نے ناں۔ اے دنیا اچ تے ایویں کھڈونا ای ہوندا ہیگا اے۔ اوعرشاں دا بدھا ہویا نکاح وے۔ وہی تقدیر' وہی سنجوگ دا لکھیا ہویا۔ [1] ہر روز ہماری بچیوں کے آنسوؤں میں یہ بات آتی ہے: سنجوگ دا لکھیا ہویا میری جھولی اچ پے گیا۔ [2] ''قسمت کا یہ لکھا'' اِدھر آنے ہی نہیں دیتا کہ کس نے ہمارے اختیار و ارادہ کو سلب کردیا' کس نے ہمیں مجبور کردیا کہ ہم زبان تک بھی یہ بات نہ لائیں' کس نے اتنا جبر کیا کہ ہمارا گلا گھونٹ دیا' یہ بھی نہ کہہ سکیں کہ اس میں ہمارا بھی کچھ حق ہے۔ جب عقد باندھتے وقت ہم سے پوچھا تھا تو توڑتے وقت بھی تو پوچھ لینا چاہیے لیکن ''ایتھے اے صورت ہے۔ معاف رکھیے' میری لگدی کسے نہ ویکھی' تے ٹڈی نوں جگ جاندا۔ او توڑن والا جیہڑا' اوٹھاہ ٹھاہ کرکے' باہر کیندا: میں طلاق دیدتی ہوئی ہیگی۔'' [3] یہ روتی رہے۔ کیا ہوا؟ عرشوں پہ بندھا ہوا ہے' سنجوگ ہے' قسمت کا لکھا ہے' جھولی آ پڑا' کوئی کچھ

---

[1] جناب! یہ جو نکاح ہوتے ہیں یہ عرشوں پہ طے ہو چکے ہوتے ہیں۔ بس دنیا میں تو یہ محض ایک کھیل تماشا ہی ہے۔ اصل تو عرشوں پر طے ہو چکا نکاح ہوتا ہے۔ یہ تو وہی تقدیر کا مسئلہ ہے کہ بس قسمت میں ہی لکھا ہے۔

[2] قسمت کا لکھا میرے پلے پڑا۔

[3] جب اس سے تعلق استوار ہوا تو کسی کو پتہ بھی نہ چلا اور جب وہ ٹوٹا ہے تو اسے دنیا جانتی ہے۔ طلاق دینے والا اٹھاہ ٹھاہ کرکے باہر کہتا ہے میں نے طلاق دے دی ہے۔

نہیں کہہ سکتا' مظلوم کی داد کی کوئی سبیل نہیں۔ بس یہی ایک تھی کہ وہ باپ کے دروازے پہ آ جاتی مگر وہ دروازے پہ اندر قدم نہیں رکھنے دیتا۔ کہتا ہے کہ بیٹی! اس گھر سے جو ڈولا گیا ہے اب تو یہاں تمہارا جنازہ ہی آ سکے گا' یہ خدا کے حکم کے خلاف ہے۔ خاوند مجازی خدا بن گیا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ملوکیت کا استبداد جو شریعت کی رو سے آتا ہے (معاذ اللہ) وہ کیا کیا گل کھلاتا ہے۔

ایمان کا چھٹا جز

عزیزانِ من! آپ کے ہاں' یہ کیا چیزیں ہیں؟ ایک ایک مسئلہ لینے کی ضرورت نہیں۔ اس کی بنیاد وہی اختیار وارادہ ہے جسے قرآن نے انسان کی بنیادی خصوصیت بتایا تھا' اسے ہی سلب کر دیا۔ حیوان کو بھی کچھ اپنا اختیار ہوتا ہی ہے' مگر اسے تو اتنا اختیار بھی نہ رہنے دیا۔ اس پہ تقدیر کا مسئلہ آ گیا۔ اس کو اتنی اہمیت دی کہ پانچ اجزائے ایمان تو خدا نے مقرر کیے: (۱) اللہ پر ایمان' (۲) اس کے رسولوں پر ایمان' (۳) کتابوں پر ایمان' (۴) ملائکہ پر ایمان اور (۵) آخرت پر ایمان۔ سارے قرآن میں یہی اجزائے ایمان ہیں۔ انہی کے ماننے سے ایمان آتا ہے۔ ان کے انکار سے کفر لازم ہوتا ہے لیکن اس کے بعد ہمارے ہاں دورِ ملوکیت کا جو ایمان ہے اس میں ایمان کا چھٹا جز و تقدیر ہے۔ اب بھی جہاں جہاں "اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ" پڑھایا جاتا ہے' اب تو بہرحال وہ رسمی سا ہے' اس میں یہ چھٹا بھی شامل ہوتا ہے۔ ایمان کے اجزاء میں یہ چھٹا ایمان لکھا ہوا ہے۔ بڑی بڑی اہم کتابیں ہیں جن میں اسے ایمان کا چھٹا جز کہا ہوا ہے۔ مجھے یاد آ گیا یہ کوئی گاؤں کے حجروں والے ملاّ کی بات نہیں ہے۔ سیرت النبی ﷺ کی وہ پانچ چھ [1] جلدیں' جو علامہ سید سلیمان ندوی (1884-1953) مرحوم نے لکھی ہیں' ان میں جہاں عقائد پہ بحث آتی ہے تو ان میں قرآن کے پانچ عقیدے تو یہ ہیں' اب کوئی سو صفحہ اس چھٹے عقیدے کے متعلق لکھا ہے۔

خود ساختہ شریعت میں کسی کو آہ وفغاں کا حق نہیں

عزیزانِ من! یہ جو عقیدہ تقدیر ہے وہ اس کو بھی جز و ایمان قرار دیتے ہیں۔ تقدیر کو یہاں تک لے آئے کہ کسی ظلم کے خلاف' کسی استبداد کے خلاف' کسی جبر کے خلاف' لب کشائی نہ ہو سکے' کوئی حق ہی نہ مانگ سکے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ معاملات کہاں تک جا پہنچے ہیں اور پھر یہ جو لطیف سی ہونے کی بات ہے کہ یہ سارا کچھ کیا بھی جائے اور محسوس بھی نہ ہونے پائے یعنی حکمرانوں کے جبر کے خلاف تو

[1] سید سلیمان ندوی مرحوم (1884-1953ء) نے سیرۃ النبیؐ کی یہ مختلف جلدیں 1918 میں' 1921 میں' 1923 میں اور نومبر 1940ء میں رقم کیں مگر ساتویں یعنی آخری جلد مکمل نہ کر پائے۔ آپ کی ایک کتاب ''خطبات مدراس'' بھی ہے جس میں ''سیرت النبیؐ'' کے مختلف پہلوؤں پر آپ کے آٹھ خطبے شائع ہوئے ہیں۔ (حوالہ: حفیظ گوہر: پاکستانی شخصیات کا انسائیکلو پیڈیا' گوہر پبلی کیشنز' لاہور' (سالِ اشاعت درج نہیں ہے)' ص ص۔ 161-162)

پھر بھی کوئی Agitation (مظاہرہ) ہوتا ہے' کوئی آہ وفغاں ہوتی ہے' کوئی بھی بات تو ہوتی ہے مگر شریعت کے راستے سے جو آپ کے ہاں جبر ہوتا ہے اس کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں تقدیر کا حصہ آ گیا۔ اسے سرمایہ داری بھی نہیں مٹا سکتی کہ رزق خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے' ملوکیت کے استبداد کے خلاف لب کشائی نہیں کی جا سکتی کہ خدا جسے چاہتا ہے حکومت دیتا ہے۔ بات میں سے بات نکل آئے گی کہ پھر خدا بھی (معاذ اللہ' معاذ اللہ) عجیب ہے: فرعون کو وہ حکومت بھی دیتا ہے' موسیٰؑ سے کہتا ہے کہ جاؤ' اس سے یہ حکومت چھین لو۔ اس کے متعلق کیا باتیں بتاؤں۔ آپ اس چیز کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتے۔ یہی چیزیں ہیں جو شریعت کے نام سے آپ کے ہاں آتی ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ ان حکمرانوں کی موجودگی میں' ان کی حکومت کے دَور میں' نہیں کہہ سکتے تھے۔ آج بھی نہیں کہہ سکتے۔ وہ حکمران ختم ہوئے' ان کی حکومتیں ختم ہوئیں مگر جو' ان اہل شریعت کی حکومت ہے' وہ قیامت تک چلتی ہے اور پھر سلسلہ در سلسلہ آگے چلتی جا رہی ہے۔ آج بھی چل رہی ہے۔ یہی جو عقیدہ تقدیر تھا آپ اسی میں آگے بڑھیے۔ اب اس میں آپ کے ہاں یہ عقیدہ آیا کہ انسان کی قسمت ستاروں کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ لو بھئی' اس سے پہلے تو پھر بھی کوئی انسان ہی تھے جن کے ہاتھوں میں یہ بات تھی' اب انسان کی قسمت ان ستاروں کے ساتھ بندھی ہوئی ہے یعنی جن ستاروں کے متعلق قرآن نے تیرہ سو سال پیشتر کہا کہ سَخَّرَ لَكُمْ (22:65) ان کو ہم نے تمہارے تابع تسخیر کر دیا۔ یہ کچھ قرآن ہی نے کہا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ ایک وقت آئے گا تم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔ وہ جن کے ساتھ ہماری تقدیر بندھی ہوئی ہے امریکہ کے خلانوردوں کی تقدیر بھی تو انہی سے بندھی ہوئی تھی۔ وہ اٹھے ہیں اور جوتے سمیت اس کے اوپر چڑھ گئے۔ کس کی تقدیر کس کے ساتھ بندھی ہوئی ہے' یہ سوچنے کا سوال ہے۔ اب وہ امریکی خلانوردان کرّوں کے ساتھ اس کے بعد جو جی میں آئے کریں گے۔ انہوں نے اتنی توانائیاں Scientific (سائنسی) طریقے سے حاصل کی ہیں اور کریں گے۔ قرآن نے کہا ہے کہ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ [1] (45:13)۔ اللہ اکبر! یہ ہے مقامِ انسانیت' یہ ہے مقامِ آدم کہ اس کے سامنے تمام ملائکہ سجدہ ریز ہیں' فطرت کی ساری قوتیں اس کے سامنے جھکی ہوئی ہیں اور یہ تھا قرآن۔ مگر مذہبی پیشوائیت نے یہ کہا کہ ہماری' آپ کی' انسانوں کی' ساری تقدیر ستاروں کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ آج اسے کہتے ہیں نجوم کا علم اور انہیں کہتے ہیں نجومی یا منجم۔ خیر سے آپ کے ہاں بھی وہ بڑے بڑے سے' کوئی پمفلٹ سے' آیا کرتے ہیں۔ ہم نے ان نجومیوں کو دیکھا تو نہیں' ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ یہ فٹ پاتھ پہ بیٹھنے والے نہیں ہیں' یہ بڑے مقام کے مالک ہیں۔ ان کے ہاں کے پمفلٹ دیکھیے۔ وہ کس شان سے نکل کے چلے آتے ہیں۔ اسلامی منجم اس کا نام ہوتا ہے۔ کیا بات ہے

---

[1] کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے' اس نے سب کو تمہارے لیے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

''توحیدی بُت پرستی کی!'' اور چونکہ بڑی عجیب ہے' اقبالؒ (1877-1938) بھی کیا بات کہہ جاتا ہے! اس نے تقدیر کے متعلق ابلیس کی زبان سے مجلسِ شوریٰ میں یہ کہا ہے کہ

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا ❶

بزبانِ اقبال ابلیس کی مجلس شوریٰ

عزیزانِ من! جب کوئی نادار ہو جاتا ہے تو وہ بے کس اور بے بس ہو جاتا ہے۔ اس کا کوئی چارہ ساز نہیں ہوتا' کوئی اس کی پرسش نہیں کرتا۔ نہ قانون اس کا ساتھ دیتا ہے' نہ عدل ساتھ دیتا ہے' نہ معاشرہ ساتھ دیتا ہے۔ غریب اور بے کس کچھ نہیں ہوتا۔ اس مایوسی کے عالم میں وہ تنکوں کا سہارا لیتا ہے' کبھی وہ فٹ پاتھوں پہ بیٹھے ایک منجم کو ہاتھ دکھا رہا ہے' کبھی اپنے ستاروں کی بات پوچھ رہا ہے اس لیے کہ انسانیت کی دنیا کے اندر اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ وہ ستاروں کو پکار کے کہہ رہا ہے کہ تم ہی کچھ میری مدد کرو۔ انسان آدم کا بیٹا ہے جس کا مقصدِ حیات تسخیر کائنات کر کے اس سے حاصل کردہ توانائی کو قرآن کی روشنی میں نوعِ انسان کی بھلائی کے لیے صرف کرنا ہے۔ وہ ستاروں سے مدد کا متمنی ہے۔ میں نے بار بار کہا ہوا ہے' عزیزانِ من! خدا آپ کو فرصت دے تو اقبالؒ (1877-1938) کی یہ نظم ضرور پڑھتے چلے جایئے' ارمغانِ حجاز میں جو اردو کا حصہ ہے' یہ اس کے اندر ہے۔ اتنی بڑی بات ہے جو ایک فقرے میں وہ کہہ گیا:

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا

کرّوں کے چہروں پر عروسی کا نقاب

عزیزانِ من! آیئے اب جس آیت سے بات چلی تھی اسے دیکھیں۔ کہا: وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ (67:5) یہ تو بڑے بڑے کرّے تھے۔ ہم نے ان کے چہرے کے اوپر عروسی کا نقاب ڈال دیا اور وہ نہایت خوبصورت جگمگاتے ہوئے چراغ بن کے تمہیں نظر آ رہے ہیں۔ واقعی اگر گرمیوں میں خدا فلیٹ سے نجات دیدے اور کہیں ایسی جگہ سونا نصیب ہو جائے جہاں آسمان نظر آتا ہو' صاف آسمان کے اوپر یہ ستاروں کی دنیا بڑی کشش رکھتی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ یہ اس کی رحمت ہے جو یہ نقاب پوش ہیں۔ اگر یہ سارے ستارے ویسے ہوتے جیسے نقاب اٹھنے کے بعد یہ چاند ایسا بھیانک نظر آ گیا ہے تو بچے ڈر کے مارے مر جاتے۔ وہ اسے اپنی رحمت کی صورت بتاتا ہے۔ یہ اس کا کتنا کرم ہے کہ کرّوں کو یہ بنا کے رکھ دیا۔ کہا: یہ صورت تھی کہ کرّوں کو یہ کچھ بنایا اور اس انسان کو

---

❶ میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

دیکھیے کہ یہ ان ستاروں کے متعلق بات کر کے نجوم کی اٹکلیں دوڑاتا ہے۔ اٹکلیں دوڑاتا ہے!! یعنی وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ (67:5)۔ قرآن نے اٹکلیں دوڑانے والوں کو شیاطین کہا ہے۔ شیاطین اُس بنیادی چیز کی سرکشی کرنے والوں کو کہتے ہیں جو خدا نے کہی ہے۔ اس نے انسان کو اختیار وارادہ دیا تھا۔ قرآن خدا کی اس نعمت اور رحمت اور بنیادی خصوصیت کے خلاف لفظ شیاطین لایا ہے جس کے معنی ''سرکشی کرنے والے'' ہیں۔ یہ جو اسلامی نجوم کہہ رہے ہیں' قرآن انہیں شیاطین کہہ رہا ہے' سرکشی کرنے والے کہہ رہا ہے کہ ہم نے تو ان کو یہ سَخَّرَ لَكُمْ بنایا تھا اور یہ انہیں بتا رہے ہیں کہ تمہاری قسمت ان ستاروں کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ اس زمانے میں کہا جا رہا ہے' عزیزانِ من! جب ساری دنیا کے اندر یہ توہم پرستیاں اور ستارہ پرستیاں موجود تھیں۔ ستارہ پرستی تو ایک مذہب بھی تھا جسے قرآن نے صابئین کہا ہے۔ ان کا یہ زیادہ حصہ ایران میں تھا۔ اگرچہ بعض اوقات انہیں مجوسی بھی کہا جاتا ہے لیکن نہیں' وہ صابئین (2:62) الگ تھے۔ یہ ستارہ پرست تھے۔ حضرتِ ابراہیمؑ کے تو قصے میں آتا ہے یہ غالباً وہی قوم تھی۔ وہ اِن ستاروں کو خدا مانتی تھی' ان کی پرستش کرتی تھی۔ یہ پرستش نہ بھی ہو تو بھی یہ چیز ہے کہ ستاروں کے ساتھ قسمتیں وابستہ ہیں۔ یہ تو قریب قریب آج ساری دنیا میں یہ بات پھیلی ہوئی تھی اور عربوں کے ہاں جو ایسی قوم تھی جس کے ہاں نہ علم تھا نہ اس سے پیشتر دین تھا' ان کے ہاں تو ساری توہم پرستیاں تھیں۔ یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ کبھی کاہن پیش گوئیاں کرنے والے زائچے بنا بنا کے اس قسم کی پیش گوئیاں کرتے ہیں' یہ وہی کچھ ہے جو ہندوؤں کے ہاں ہوتا ہے' وہ ہاتھوں کی لکیریں دیکھ کے پیش گوئیاں کرنے والے ہیں۔ یہ کاہن بھی ایسے ہی ہیں۔ قرآن نے شاعر بھی کہا۔ شاعر یہ نہیں ہیں کہ نظم میں کوئی شعر کہنے والے ہوں۔

توہم پرستی کی مختلف شکلیں

عزیزانِ من! ان عربوں کے ہاں یہ عقیدہ تھا کہ انہیں بھی الہام ہوتا ہے۔ انہیں ساحر بھی کہا' شاعر بھی کہا اور منجم بھی کہا۔ یعنی مذہب کی دنیا میں جہاں جہاں بھی جبر اور استبداد تھا یعنی انسان کے اختیار وارادے کو سلب کرنے والے جتنے عقائد تھے' قرآن نے ان کے خلاف چیلنج دیا اور یہ جو اس دور میں عام طور پہ اور خاص طور پہ عرب میں توہم پرستی کی رسومات یا عقائد تھے ان میں کاہنوں کا تو پوچھیے نہیں قرآن نے ان کے ہاں کے سحر کے دعویداروں کے خلاف چیلنج دیا۔ اور یہاں آپ دیکھیے کہ یہ جو منجم تھے' جو نجوم کے ذریعے قسمتیں بتانے والے تھے' یہاں ایک تو یہ بات کہی کہ وہ جو تاریکی میں اٹکلیں دوڑانے والا ہوتا ہے' وہ اس کو رجوماً للشیٰطین کہتے ہیں۔ رجم کے معنی ویسے تو کچھ پھینکنا ہوتا ہے۔ وہیں سے یہ عقیدہ رجم ہے' پتھر مار کے سنگسار کر دیتے ہیں۔ یہ بنیادی طور پہ وہی لفظ ہے۔ ان کے ہاں عربی زبان کے اندر رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ قیاس آرائیاں کرنے کو کہتے تھے یعنی تاریکیوں میں تیر پھینکنا کہ پتہ نہیں نشانے پہ لگا یا نہیں۔

ہمارے ہاں بھی یہ ہے کہ لگ گیا تیر نہیں تے تکا [1] ۔ یہ بعینہٖ اس معنی میں آتا ہے۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ یہ تو ستارے تھے ان کی کیفیت دیکھو کہ اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔ ستاروں سے یہ عقیدہ بندھا ہوا ہے کہ تمہاری قسمت ان کے ساتھ وابستہ ہے۔ آپ کے ہاں تو اب پھر ان کے متعلق بڑے بڑے میگزین نکل رہے ہیں۔ ان میں دیکھیے۔ اب تو اس کا خاص ایڈیشن اسلامی ایڈیشن چھپتا ہے اس میں تو ان کے متعلق پورا ہی صفحہ ہوتا ہے۔ اب تو یہ علمِ نجوم ستاروں کا علم زہرہ میں داخل ہو گیا ہے مریخ کے اِدھر آ گیا اور افراد کا ہی نہیں قوموں کا ملکوں کا حکومتوں کا اور اب اس حکومت امریکہ کا بھی علم نجوم اس میں شامل ہے۔ جیسا میں نے کہا ہے کہ وہ تو اس زہرہ کے اوپر بھی چڑھ دوڑے۔ یہ زائچے میں بھی بتاتے ہیں۔ اب نہ افراد میں کوئی اختیار وارادہ نہ قوموں میں اختیار وارادہ۔ وہ تو بہرحال اس پہ مذاق سمجھ کے ہنس دیتے ہیں۔ آپ نے اپنے ہاں تقدیر کا جو یہ عقیدہ بنا رکھا ہے اور تقدیر ان چیزوں کے اوپر ہے تو آپ کی تو قومیں بھی تقدیر پہ چلتی ہیں افراد بھی تقدیر پہ چلتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو مولا دی مرضی، [2] یہ ہے رُجُوْمًا لِّلشَّیٰطِیْنِ.

اقبالؒ اور قرآن

عزیزانِ من! ہمارے دَور میں اقبالؒ (1877-1938) جو قرآن کیطرف دعوت دیتا تھا اور شرفِ انسانیت کا سب سے بڑا مبلغ تھا نے برملا کہا تھا کہ

آدمیت احترامِ آدمی
برتر از گردوں مقامِ آدمی

اسی لیے اس نے پھر نجوم اور منجموں کے متعلق بھی یہ کہا کہ

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تُو تابع ستارہ نہیں

خاکِ زندہ اور خاکِ مردہ میں کیا ہی خوب فرق کیا۔ دوسری جگہ ہے کہ

ستارہ کیا میری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

---

[1] وہ تیر جس میں بھال نہ ہو۔ [2] مرضی یار کے خلاف نہ ہو لوگ میرے لیے دعا نہ کریں

کیا الفاظ ہیں: ''وہ کیا خبر دے گا'' اقبالؒ اس دَور میں بہت بڑا مبلغ تھا۔ یہ شرفِ آدمیت کی اس بنیادی حقیقتِ انسانیت کا بہت بڑا مبلغ تھا۔ اس نے کیا ہی خوب کہا تھا کہ

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تُو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے
تُو اپنی سر نوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں ❶

تجھے Plain (صاف) سلیٹ دی ہے اب تُو اپنی سرنوشت خود اپنے قلم سے لکھ اور سارا قرآن اسی سے بھرا پڑا ہے۔ عزیزانِ من! بات یہاں سے چلی تھی کہ کوئی عقیدہ' کوئی تصور' کوئی نظریہ' کوئی مسلک' کوئی نظم ونسق' جو انسان کے شرفِ اختیار وارادہ کو کم کرتا ہے یا اس کے راستے میں حائل ہوتا ہے' قرآن کے خلاف ہے تو قرآن اس کے خلاف چیلنج دیتا ہے۔

صرف اور صرف خدا کے قانون کی حکمرانی

عزیزانِ من! ایک ہی چیز ہے جسے میں نے کہا ہے کہ قرآنِ کریم نے خدا کے اصول دیئے ہوئے ہیں۔ یہ اس کی ہدایات ہیں جواب قرآنِ کریم میں موجود ہیں۔ اور میں نے گزارش کیا ہے کہ اس میں بھی جو ہدایات دی ہیں وہ انہیں بالجبر نہیں منواتا' زبردستی نہیں منواتا' خود کہہ دیا کہ ہم دخل نہیں دیتے۔ انسانوں سے کہا کہ تمہارا جی چاہے مانو' جی چاہے نہ مانو۔ نبی اکرم ﷺ کے متعلق کہا کہ ہم جانتے ہیں تیرا دل بڑا کڑھتا ہے کہ کیوں یہ تباہی کی طرف جاتے ہیں' کیا تو ان کو مجبور کرے گا کہ صحیح راستے کی طرف آ جائیں۔ وہ تو رسول کو بھی اس کی اجازت نہیں دیتا مگر یہاں آپ کے ہاں One way traffic (یک طرفہ ٹریفک) کی چیز ہے کہ کسی نے کلمہ پڑھ لیا' اب مسلمان ہو گیا' اس کے بعد وہ ان مسلمانوں کی اصلی حالت کو دیکھ کر اگر ہزار چاہے کہ میں یہاں سے واپس چلا جاؤں تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! اس کے اندر Entry (داخلہ) ہے' واپس نہیں جا سکتے۔ واپس جانے والا مرتد اور مرتد کی سزا قتل ہے۔ یہ کسی حکومت کے قانون میں نہیں کہ ہماری مملکت میں Citizenship (شہریت) قبول کر لینے کے بعد وہ انکار نہیں کر سکتا' یہ کسی حکومت کا قانون نہیں ہے۔ یہ آپ کے ہاں کی شریعت ہے کہ نکل کے بھی نہیں جا سکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ (2:167) یہ

---

❶ پرویزؒ: سلیم کے نام (ایڈیشن 1981) جلد اول' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1981' ص۔ 51

جہنم میں ہیں، جہنم سے نکل ہی نہیں سکتے۔ یہاں تک جبر کی یہ صورت ہے اور اس کے لیے وَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ ❶ (67:5) ہے۔ وہ ان منجموں کے لیے تو کیا کہے گا' یہ جوان سے جا کے اپنی تقدیریں پوچھنے والے ہیں وہ سارے اس عَذَابَ السَّعِيْرِ کے اندر شامل ہیں، یعنی متاعِ حیات جھلس کر رہ جاتی ہے۔ یہ ہے اس کا ترجمہ۔ متاعِ حیات تو بنتی ہی سرگرمیٔ عمل سے ہے' حرکت سے ہے' چوائس سے ہے' اختیار و ارادے سے ہے' عزم سے ہے۔ جب یہی سلب ہو جائے تو باقی کیا بچے گا۔ آپ غور کیجیے کہ قرآن کی تشبیہات کے کیا الفاظ ہوتے ہیں: عَذَابَ السَّعِيْرِ (67:5)۔ وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ط وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ❷ (67:6)۔ وہاں عذاب سعیر (67:5) کہا ہے' پھر عذاب جہنم (67:6) کہا۔ جہنم کے متعلق قرآن کے مختلف مقامات میں ہے: خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا (5:33)۔

مختلف قسم کا عذاب

عزیزانِ من! کتنے ہی مختلف قسم کے عذاب ہیں: ذلت اور خواری کا عذاب' محتاجی اور مسکینی کا عذاب' ماتحتی کا عذاب۔ یہ جتنے عذاب ہیں' یہ سارے جہنم کے ہیں اور پھر جحیم بھی تو آیا ہے کہ جہاں کسی کی حرکت رک جائے' وہیں کھڑا ہو جائے' آگے نہ چل سکے' پروگریس نہ کر سکے' آگے نہ بڑھ سکے۔ آپ یہ مقام دیکھتے ہیں کہ پھر تقدیر کے عقیدوں سے کیا ہوتا ہے کہ جو قسمت میں لکھا ہے وہ ہو جائے گا۔ اس سے آپ سوچ سکتے ہیں کہ قوموں کی کیا حالت ہوتی ہے۔ یہ سوچنے کی تو بات ہی نہیں' ہم تو صورت ببیں حالش مپرس ❸ ہیں۔

ملت اسلامیہ ہزار برس سے ایک مقام پر رُکی ہوئی ہے

ہماری اپنی حالت یہ ہے کہ ہزار برس سے ایک مقام کے اوپر رُکے ہوئے ہیں۔ اس قوم کی یہ حالت کیوں ہوئی ہے؟ جی! خدا نے اس کی قسمت میں لکھا ہی ایسا ہے' تقدیر ہی اس کی ایسی ہے' بدل ہی نہیں سکتی۔ تم اس کے خلاف' خدا کے خلاف' اس کو چیلنج دے کر یہ

---

❶ ان کا انجام بڑا ہلاکت آمیز ہوگا۔

❷ جو لوگ بھی زندگی کے کسی گوشے میں قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ان کا انجام تباہی اور بربادی ہوتا ہے' اور یہ بہت برا انجام ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❸ صورت دیکھ لو۔ حال پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

قریباً ابتدائی آیات میں' جو قصہ آدم بیان کیا' وہ آدمی کی سرگزشت ہے۔ اس کے اندر بنیادی چیز ہی یہ بیان کی ہے کہ آدم یعنی آدمی سے بھی خطا ہوئی' سہو ہوا' لغزش ہوئی' ابلیس نے اس سے بھی زیادہ سرکشی کی۔ یہاں آدم کے ہاں تو لغزش ہی ہوئی تھی' ابلیس نے چیلنج کیا ہے۔ خدا نے آدم سے پوچھا کہ تم نے یہ کیوں کیا؟ اس نے ذمہ داری کو قبول کیا اور کہا: ہاں میں نے کیا' غلطی کی' بھول گیا' خطا ہوگئی یعنی اپنے اختیار سے انکار نہیں کیا۔ یہ بات قبول کی کہ میں نے کیا ہے۔ اس سے یہ شرفِ انسانیت تو باقی رہا۔ لغزش ہو جانا اور بات ہے' غلط فیصلہ ہو جانا اور بات ہے۔ فیصلہ تو خود کیا۔ کہا: جب تو اپنے اختیار و ارادے سے انکار نہیں کر رہا اور ذمہ داری قبول کر رہا ہے تو تجھ میں اصلاح کی گنجائش ہے اس لیے ہم تجھ کو اجازت دیتے ہیں' موقعہ دیتے ہیں کہ اپنی اصلاح کر لو۔ تم میں اصلاح کی گنجائش ہے۔ ابلیس سے کہا کہ تو نے یہ کچھ کیوں کیا؟ اس نے کہا: آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں یہ ذرہ ناچیز' مجھ میں یہ کیا ہمت کہ آپ کے ہوتے ہوئے' آپ کے حکم کے بغیر' پتہ نہیں ہل سکتا' میں بھلا یہ کر سکتا تھا! کہا کہ تو اپنے اختیار و ارادے سے انکار کرتا ہے۔ تیری قیامت تک اصلاح نہیں ہو سکے گی۔ شیطنت تو یہ تھی کہ سرکشی برتی۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہاں قرآن نے اس کے لیے کیا لفظ استعمال کیا ہے؟ یہاں قرآن کریم نے اس کے لیے ابلیس کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی ہیں: قیامت تک اصلاح سے مایوس رہو' محروم رہو۔ ابلیس کے تو معنی ''مایوس'' کے ہوتے ہیں۔ سرکشی اور لغزش ہو جائے ٹھیک ہے' اپنے گناہ کا اعتراف کرو' ذمہ داری قبول کرو' وہی جو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے اس سے انکار نہ کرو۔ فارسی کا شعر ہے لیکن کیا عرض کروں کہ اقبالؒ (1877-1938) کیا کہہ گیا:

شاخِ نہالِ سدرہ' خار و خس چمن مشو
منکر او اگر شوی منکر خویشتن مشو ❶

تُو تو وہ شجرِ سدرہ ہے' جو سات آسمانوں کے اوپر محصور ہے' تو خوشگوار ہے۔ اقبالؒ انسان سے کہہ رہا ہے کہ تیرا تو وہ مقام ہے مگر تو باغ کے یہ جھاڑ جھنکار بن رہا ہے تو پہچان کہ تیرا مقام کہاں آ رہا ہے؟ منکرِ او اگر شوی۔

---

❶ دین کی ساری عمارت انسانی ذات پر ایمان کی بنیادوں پر اٹھتی ہے۔ جو شخص محض جسمانی زندگی ہی کو منتہیٰ سمجھتا ہے' اس کا خدا پر ایمان لانا بے معنی ہے۔ خدا' وحی' رسالت' آخرت پر ایمان کی ضرورت ہی اس لیے پڑتی ہے کہ انسان اس حقیقت پر ایمان رکھے کہ زندگی اسی جسم کی زندگی نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے اور مقصدِ زندگی اس کی نشوونما ہے۔ جو اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہے وہ ''مومن'' ہے۔ اس کا اظہار حضرت علامہ اقبالؒ نے کیا ہے اور کہا ہے کہ میری شمشیر اگرچہ اس وقت بڑی زنگ آلود ہے لیکن یہ ہے اصل فولاد کی ساختہ۔ اس لیے آپؐ اپنی توجیہات کی سان پر چڑھا دیجیے تاکہ یہ صیقل ہو جائے اور اس کی کاٹ تیز تیز ہو جائے۔ حضرت علامہ کا نظریہ یہ تھا کہ انسان اپنی ذات کا منکر نہ ہو اور خدا کے منکر سے کہیں زیادہ کافر وہ ہے جو اپنی ذات کا منکر ہے اس لیے کہا ہے کہ اگر تو اس کا انکار کرتا ہے تو کوئی بات نہیں' ابھی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی مگر تُو اپنا انکار نہ کر۔ یہ ہے تیرا مقام۔

تقدیر کا دوسرا نام: میں نہیں کر رہا' خدا کر رہا ہے

اگر ابھی تمہاری سمجھ میں بات نہیں آئی' خدا کا اقرار بھی تو نہیں کر رہا' کوئی بات نہیں' منکرِ خویشتن مشو۔ اپنا انکار نہ کر۔ اپنا انکار تو یہ ہے کہ میں کون ہوں یہ کرنے والا۔ مجھ میں تو یہ استعداد ہی نہیں' اختیار ہی نہیں' ارادہ ہی نہیں۔ یعنی یہ چیز کہ میں نہیں کر رہا' وہ کرا رہا ہے۔ یہ کہنا کہ میں نہیں کر رہا' خدا کرا رہا ہے۔ وہ اس کو ابلیس قرار دیتا ہے۔ اور یوں ہمارے ہاں وہ سارے عقائد چلے: مرضی مولا بر ہمہ اولیٰ۔ اس کی رضا کے اندر سب کچھ ہے شریعت کی طرف آؤ تو بھی اور اگر طریقت کی طرف آؤ تو بھی۔ شریعت تو پھر بھی ایک خشک ٹہنی ہوتی ہے اور یہ طریقت ہے یہ تو پانی میں گری ہوئی ٹہنی ہوتی ہے۔ یعنی ہر جگہ آپ کو یہ ملے گا کہ تو کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ سب کچھ اس سے ہوتا ہے' اس کی مرضی سے ہوتا ہے' اور رضائے حق کے مطابق چلنے کا نام ہی اسلام ہے۔ شاید آپ کو پہلے بھی بتایا ہے کہ حسرت موہانی [1] جیسا اتنا بڑا انقلابی کہ جس زمانے میں آپ کے ہاں کے بڑے بڑے جو کانگریس میں تھے' اس زمانے میں یہ لوگ بھی ابھی ڈومینین سٹیٹس کے اوپر راضی ہوتے تھے' وہ بھی ان کے خلاف بغاوت کر کے اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ ہمارا مطالبہ کامل آزادی ہونا چاہیے۔ یہ اتنا بڑا انقلابی شخص' بڑا درویش آدمی تھا۔ وہ بھی جب عقیدے پہ آ گیا تو یہ کہہ رہا ہے:

مرضی یار کے خلاف نہ ہو
لوگ میرے لیے دعا نہ کریں

میں تو مرضی یار کے خلاف کرونگا ہی نہیں' آپ بھی نہ کیجیے۔

موجودہ اسلام کی حالت زار

عزیزانِ من! یہ چیزیں شاعری نہیں ہیں' یونہی عقائد نہیں ہیں' یہ گاؤں کے کچی روٹی والے ملاّ کی بات نہیں ہے۔ آپ کا اسلام یہ بن چکا ہوا ہے۔ یہ ہزار برس سے دَورِ استبداد کا اسلام ہے۔ اس لیے کہ یہ عقیدہ وضع کیا گیا تا کہ جو ملوکیت کر رہی تھی' جو سلاطین کر رہے تھے' جو بادشاہوں کے ظلم و ستم ہو رہے تھے' اُس کے خلاف آواز نہ اٹھے۔ جہاں کسی نے ایک آواز اٹھائی' اسے کہا کہ یہ تو سب خدا کا کیا ہوا ہے' ان کو تو بادشاہ بنایا ہی اس نے ہے' خاموش رہو۔ یہ وہی استبداد ہے جو آپ کے ہاں ہزار سال سے چلا آ رہا ہے۔ آپ کے ہاں یہ عقیدہ تقدیر نس نس میں رس چکا ہے۔ آپ اسے کہاں کہاں سے نکالیں گے۔ یہ عقائد تو آپ کے خون کے ذرات میں حلول کر چکے ہیں'

---

[1] فضل الحسن حسرت موہانی (1875-1951)

جزوِ ایمان بن چکے ہیں۔ تقدیر کے ان عقائد سے ساری طریقت بھری پڑی ہے' ساری شریعت اس سے بھری پڑی ہے' تو پھر راوی عیش لکھتا ہے۔

عزیزانِ من! میں نے شروع میں ہی عرض کیا تھا کہ اگر آج کے درس میں یہ ایک ہی آیت ہو جائے تو غنیمت ہے۔ بہرحال غنیمت ہے کہ یہ ہو گئی ہے۔ آج پانچ اور چھ دو ہی آیتیں ہم لے سکے ہیں۔ سورۃ الملک کی ساتویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔ ان میں بھی وہ پچھلی آیت کی ہی مزید تفصیل چلی آ رہی ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀❀❀......❀

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سید حسن عباس رضوی، کوئٹہ

طلوع اسلام نے کیا کیا ہے؟

آغازِ کلام: یوں تو اس سوال کا جواب بڑا ہی مختصر ہے کہ طلوع اسلام نے کیا کیا ہے۔ وہ یہ کہ طلوع اسلام نے خمخانۂ حجاز کی ٹوٹی پھوٹی صراحیوں کی ٹھیکریاں جمع کر کے ان پر لکھی ہوئی داستانِ پارینہ کو ازسرِنو مرتب کیا ہے۔ دنیائے انسانیت کو وہ فکر صالح عطا کی ہے جس سے بیگانہ ہو کر وہ جہالت کی تاریکی میں دم توڑ رہی تھی۔ کاروان حیات کو منزل کی طرف بڑھنے کے لئے صراط مستقیم کی نشاندہی کر دی ہے۔ ایک متعین اور واضح نصب العین عطا کیا ہے۔ فلسفۂ حیات کا مکمل مفہوم پیش کیا ہے۔ کائنات کی بلندیوں اور پستیوں کے اسرار بے نقاب کر دیئے ہیں۔ اور مافیہا کا سینہ چاک کر کے رموزِ فطرت انسانیت کے سامنے بے مزد و معاوضہ پیش کر دیئے ہیں۔

لیکن اگر تفصیلاً بیان کیا جائے کہ طلوع اسلام نے کیا کیا ہے، تو اس کے لئے ایک طویل فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔ لیکن وقت کی قلت کی وجہ سے ایسا کرنا ممکن نہیں۔ میں چند ایک ایسی چیزوں پر اکتفا کروں گا جو مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔

سب سے پہلی انقلابی دعوت: طلوع اسلام نے سب سے پہلے یہ بتایا ہے کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ دین یعنی نظام حیات (Social Order) ہے جس کے بنیادی اصولوں اور ہدایات کا سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ جسے اپنا کر انسان جنت کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ خدا کی طرف سے دین ہی حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے ملا تھا۔ دین انسان کی ہیئت اجتماعیہ سے تعلق رکھتا ہے۔ برعکس اس کے مذہب ذاتی عقائد اور رسم و رواج کا مجموعہ ہے۔ اس میں تفکر و تدبر کو کوئی دخل نہیں، اس کا انسان کی اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سب انسان کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔ یہ انسانیت کے جسد واحد کا شیرازہ بکھیرتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان ایک ایسی دنیا میں داخل ہوتا ہے جہاں سلامتی اور امن کا چراغ گل ہو جاتا ہے اور ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا ہے۔ فساد آدمیت کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جدھر نگاہ دوڑائیں دنیا رزمگاہ ابلاس نظر آتی ہے۔ پھر یہیں سے

مذہبی پیشوائیت جنم لیتی ہے اور مجبور و مقہور انسان کو طرح طرح کے فریب دے کر اپنے پیچھے لگا لیتی ہے۔ وہ اپنی بقاء کے لئے محنت کرتے کرتے ہلکان ہو جاتا ہے اور یہ ان کی کمائی پر عیش اڑاتی ہے۔ ایسی زندگی کو قرآن نے دوزخ کی زندگی کہا ہے۔

برادران عزیز! آپ نے دین اور مذہب کا تقابل دیکھ لیا۔ جب تک دین خداوندی کی عطا کردہ اقدار کی پیروی ہوتی رہی' انسان پر ابر رحمت کی گہر باریاں ہوتی رہیں اور جونہی انسان نے دین خداوندی کو چھوڑ کر اپنے کردار کو خود ساختہ پیمانوں کے تابع کر کے ہیئت اجتماعیہ کا شیرازہ بکھیر دیا تو تمام افرادِ خانہ ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے اور چاروں طرف فساد اور خوں ریزی برپا ہوگئی اور اس طرح شرف انسانیت مذہب کی بھینٹ چڑھ گئی۔

مسلمانوں کی حالتِ زار: عام انسانوں سے ہٹ کر اب عالم اسلام کی طرف آیئے۔ اس ملت نے بھی جب دین کو چھوڑ کر مذہب اختیار کیا اس سے وہ تمام سرفرازیاں اور نعمتیں چھن گئیں جو مسلمانوں کا طغرۂ امتیاز تھیں۔ اس کی اجتماعی زندگی پارہ پارہ ہوگئی۔ ابلیسیت نے پھر سر اٹھایا۔ وہی ابلیسیت جو نور مبین آ جانے پر صحراؤں' جنگلوں اور غاروں میں جا چھپی تھی۔ کہیں شاہی درباروں میں عشوہ طراز ہوئی' کہیں جبہ و عمامہ میں جلوہ افروز ہوئی اور کہیں مقدس مقامات میں نمودار ہوئی۔ یہاں تک کہ پوری آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آ گئی۔ وہی دیرینہ اسباقِ سامری ایک ایک کر کے سامنے آتے چلے گئے اور اپنے مخصوص سحر کارانہ انداز سے معاشرتی نظام میں پیوست ہوتے چلے گئے۔ اس طرح ہوائے شیطنت ڈگمگاتی ہوئی کشتیوں کو ڈبوتی رہی۔ قلزمِ طاغوت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر رموزِ جہانبانی کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا اور خیر الامم آسودہ ساحل ہو کر دل کو یہ تسلیاں دیتی رہی کہ یہ میری نہیں کسی اور کی کہانی ہے۔ وہ قیامت کے مسائل حل کرتی رہی۔ لیکن اسے یہ قیامت دکھائی نہ دی کہ

گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا

اور ایک وقت ایسا آیا کہ اس کی سطوت و جبروت کی صرف کہانیاں باقی رہ گئیں۔ اس کے بعد مسلمان تذبذب اور بددلی کے عالم میں مارا مارا پھرتا رہا۔ زمین اس پر تنگ ہو گئی۔ اس کے لئے ایک لمحہ ستانے کے لئے بھی ٹھکانہ نہ رہا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر کوئی بھیڑ بکری کی طرح اسے جس طرف چاہتا ہنکا لے جاتا۔ اس محرومی اور ناکامی کی حالت میں مسلمان در بدر خاک بسر پھر رہا تھا۔ ندرتِ فکر اور جدتِ کردار جیسی متاعِ بے بہا اس سے چھن چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے اور کدھر جائے۔ اسے اس گرداب بلا سے نکالنے والا کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے تھے کسی مردِ راہداں کے لئے

مرد راہداں : آخرکار مبدائے فیض کی کرم گستری سے انہی میں سے ایک مرد راہداں پیدا ہوا جسے اہل فکر پرویز کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کہا جائے گا کہ پرویز بھی ایک مفکر ہے اور دوسری تحریکوں کے سربراہ بھی مفکر ہیں۔ آخر اس میں کیا خاص بات ہے۔ وہ خاص بات یہ ہے کہ پرویز کی فکر، قرآن حکیم کے خالص چشمۂ نور سے منور اور مُستنیر ہے۔ محترم پرویز صاحب نے جو فکر پیش کی ہے وہ بالکل منفرد کیفیت کی حامل ہے۔ اس کا ثبوت اہل جبہ وعمامہ کی غوغا آرائی سے ملتا ہے۔

دوسری انقلابی دعوت : دماغ میں فکر بلند کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے پرویز صاحب کے سینے میں قلب حساس بھی رکھا ہے یہی وہ قلب حساس ہے جس نے ملت کی محرومی کی المناک داستان اور مسلسل ناکامی کی وجہ سے ان کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے تاریخ انسانیت پر طائرانہ نگاہ دوڑائی۔ ان کے سامنے انسان کے کمال و زوال کے تمام واقعات سینما فلم کی طرح ایک ایک کر کے آتے گئے۔ اب اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ ملت اسلامیہ کے زوال کا سبب کیا ہے۔ خدا کی طرف سے عطا کردہ قرآنی بصیرت کی بدولت اس مرد دوربین کی نگاہوں نے فوراً بھانپ لیا کہ ملت کا مرض قرآن کی رفاقت سے محرومی ہے۔ اس کا دین مذہب میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس کا مرکز چھن گیا ہے۔ وہ شجر ممنوعہ کی طرح ایک سو ایک شاخوں میں بٹ چکی ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور عبادت کا مفہوم بدل گیا ہے۔ مذہبی پیشوائیت، ملوکیت اور سرمایہ دارانہ ذہنیت پیدا ہو چکی ہے۔ جب مرض کی علت اور علامات معلوم ہو گئیں تو علاج بھی سامنے نظر آنے لگا۔ انہوں نے دیکھا نہ یہ مرض نیا ہے نہ اس کے لئے کسی نئے علاج کی ضرورت ہے:

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی

محترم پرویز صاحب نے دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی اور لگی لپٹی رکھے بغیر کہہ دیا کہ بیماری قرآن سے دوری کی ہے۔۔اور علاج ''تمسک بالقرآن''۔

دین کے نفاذ کے لئے خطۂ ارض کی ضرورت

لاینفک ہے : برادرانِ عزیز! ''الدین'' یعنی اسلامی نظامِ حیات کا ضابطۂ قوانین۔یعنی قرآن تو موجود تھا مگر اس نظام کی اہم کڑی جس کے بغیر تمسک بالقرآن کا عمل (Process) تکمیل نہیں پا سکتا موجود نہیں تھی۔ یہ اہم کڑی قوتِ نافذہ یعنی مرکزِ ملت تھی۔ قوتِ نافذہ نہ ہو تو قانون نافذ نہیں ہو سکتا۔ لیکن قانون اور قوت نافذہ کے ساتھ خطۂ ارض کی بھی ضرورت ہوتی ہے، جہاں یہ قانون نافذ کیا جائے۔ امم سابقہ کی تاریخ جو قرآن میں محفوظ ہے، ہمیں بتاتی ہے کہ نظام خداوندی کے نفاذ کے لئے ہر نبی کے پیش نظر خطۂ ارض کی ضرورت لاینفک رہی ہے۔ حضرت

موسیٰؑ کی صحرا نوردیاں اوران کی تلاطم خیز داستانِ جہاد شاہد ہے کہ وہ ایک ایسے خطۂ زمین کی تلاش میں وقف اضطراب رہے جہاں بنی اسرائیل کو آباد کیا جائے اور وہاں پھر وہ نظام قائم کیا جائے جس کے لئے اللہ نے ان کو مامور کیا تھا۔ یعنی لتجزٰی کل نفس بما تسعیٰ (۲۰/۱۵) ہر فرد اپنی محنت کے بھرپور نتائج حاصل کرے اور کوئی آدمی اپنی محنت کے پھل سے محروم نہ رہے۔

نظریۂ پاکستان: یہ وہ ضرورت تھی جس کا احساس سرسید احمد رحمتہ اللہ علیہ کو ایک عرصہ پہلے ہو چکا تھا۔ اور جس کی آرزو کی تکمیل کے لئے ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ نے الہ آباد مسلم لیگ کے اجلاس میں ایک خطبہ کے دوران پاکستان کا منصوبہ پیش کر دیا تھا۔ اس پروگرام کی تکمیل کے لئے اقبال کی جوہر شناس نگاہ نے قائداعظم محمد علی جناح علیہ الرحمتہ کا انتخاب کر لیا تھا۔ نظریہ پاکستان کی مخالفت میں ہندوؤں کے علاوہ نیشنلسٹ مسلمان اور علماء بھی میدان میں نکل آئے تھے۔ اس وقت ایک ایسے مفکر قرآن کی ضرورت تھی جو نیشنلسٹ علماء کو قرآن کی روشنی میں مسکت جواب دے سکے۔ فطرت کی طرف سے یہ فریضہ پرویز صاحب کے سپرد ہوا۔ ۱۹۳۸ء میں قائداعظمؒ نے سرسید اور شاعر مشرق کے حسین خواب کی تعبیر پیش کرنے کے لئے پاکستان کی تحریک چلائی اور اس تحریک کی ہمنوائی میں پرویز صاحب نے ماہ نامہ طلوع اسلام کے اجراء کے ساتھ تحریک طلوع اسلام کا باقاعدہ آغاز کیا۔

عزیزانِ گرامی! وہ کتنا مبارک اور حسین منظر تھا جب یہ دونوں تحریکیں دین خداوندی کے غلبہ کی خاطر پہلو بہ پہلو منزل کی طرف گامزن ہوئیں۔ ان حالات کی روشنی میں دیکھا جائے تو تحریک پاکستان کے اصل محرک سرسید احمد خانؒ حضرت علامہ اقبالؒ حضرت قائداعظمؒ اور محترمی پرویزؔ ہیں۔ طلوع اسلام کا پہلا دور قیام پاکستان پر منتج ہوا۔

دوسرا دور پہلے سے کہیں زیادہ اہم اور سعی و کاوش کا متقاضی تھا۔ کیونکہ خطۂ زمین تو مل گیا تھا لیکن اس قانون' اس نظام کا نفاذ ہنوز باقی تھا جس کی خاطر پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ اس میں قانون خداوندی کا نفاذ اور غلبہ ہی ایسی چیزیں تھیں جنہوں نے پرویز صاحب کو علامہ اقبالؒ کی راہنمائی کے مطابق حضرت قائداعظمؒ کے ساتھ اشتراک پر آمادہ کیا تھا۔ ورنہ طلوع اسلام کو نہ تو مذہبی فرقہ بننا مقصود تھا اور نہ سیاسی جماعت۔ طلوع اسلام کے سامنے نہ کوئی ذاتی مفاد تھا نہ ہوسِ اقتدار۔ اس کے پیش نظر صرف اسلامی نظام کا نفاذ تھا جس کے ذریعے اقتدار کو خدا اور خدا کے قانون کے لئے مخصوص کیا جائے۔ کیونکہ اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہوسکتی ہے۔

تیسری انقلابی دعوت: برادرانِ عزیز! تاریخ گواہ ہے کہ دنیا میں مقابلہ نظامہائے حیات کے مابین ہوتا ہے نہ کہ ذاتی عقائد اور مذاہب کے درمیان۔ جو نظام امن عالم

اور سلامتی کی ضمانت دیتا ہے دنیا اس کی طرف جھکتی ہے۔ آپ کے عقائد بظاہر کتنے ہی خوبصورت کیوں نہ ہوں جب تک آپ کے پاس انسان کی خوشحالی کے لئے ٹھوس نظام نہیں ہوگا' آپ کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ جس نے افراد کی ضرورت سے چشم پوشی کی' وہ نظام کبھی پنپ نہیں سکا اور ظاہر ہے یہ مقاصد اسی صورت میں پورے ہو سکتے ہیں جب کسی ملک میں رزق کی فراوانی ہوگی۔ یہی وہ نظریہ ہے جسے طلوع اسلام اس شدومد سے پیش کرتا چلا آ رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ کوئی ملک ہو' کوئی بھی نظام ہو' اس کے امن اور سلامتی کا راز اس کی معیشت کے استحکام میں مضمر ہے۔ اس کی خوشحالی کا دارومدار اس کی معاشی حالت پر ہے۔ اس کے باشندوں کی نشوونما کا انحصار اس ملک کی معاشیات پر ہے اور معاشیات کا انحصار ملک کے ذرائع پیداوار پر ہے اور قرآن کی اصطلاح میں ''خزائن الارض'' پر ہے اور خزائن الارض سے پورا پورا فائدہ صرف اور صرف اسی صورت میں حاصل کیا جا سکتا ہے جب وہ افراد کی بجائے قرآنی نظام کی تحویل میں ہوں تاکہ ہر فرد معاشرہ کو اس کی ضرورت کے مطابق ہر چیز مرکز کی طرف سے ملتی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ طلوع اسلام نے قرآن حکیم کے ان گوشوں کو ایک ایک کر کے بے نقاب کیا جن کا تعلق اسلامی نظام معیشت سے ہے۔ ان جواہر ریزوں پر مشتمل ایک مبسوط کتاب بعنوان ''نظام ربوبیت'' میں محترم پرویز صاحب نے ایک واضح اور متعین پروگرام پیش کیا ہے۔ تحریک طلوع اسلام کا عملی پروگرام اسی کتاب پر مبنی ہے۔ اس کتاب میں نظام حیات کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس مختصر سے وقت میں ان کو کلیتہً تو نہیں دہرا سکتا البتہ ان کا خلاصہ عرض کرتا ہوں۔

نظامِ ربوبیت میں کیا ہے: (۱) اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جاتی ہے اور کوئی فرد معاشرہ اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ (اسے ربوبیت عامہ یعنی تمام نوع انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے)۔

(۲) کوئی فرد بھوکا' ننگا' یا بے گھر نہیں رہے گا۔ تمام افراد کے لئے خوراک' لباس اور مکان کا انتظام کرنا معاشرہ کے ذمہ ہوگا۔

(۳) معاشرہ کی یہ بھی ذمہ داری ہوگی کہ ہر شخص کی تعلیم و تربیت' علاج معالجہ کا تسلی بخش اور بلا قیمت انتظام کرے۔ تعلیم و تربیت کا منشاء حصول علم کے علاوہ فرد کی ذات کا استحکام اور اس کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہوگا۔ بالفاظ دیگر معاشرہ کا وجود فرد کی ذات کی تکمیل کے لئے ہوگا۔

(۴) ربوبیت عامہ کے مقصد عظیم کے حصول کے لئے (قرآن کی رو سے) ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد

کی ملکیت کے بجائے قرآنی معاشرہ کی تحویل میں رہیں۔ تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے۔ اور اس طرح کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔ اس کو قرآنی نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ قرآن ایک ایسا نظام حیات تجویز کرتا ہے جو افراد کی معاشی ہمواری کا ضامن ہے۔ وہ اس کا واحد حل یہ بتاتا ہے کہ تمام ذرائع آمدن و وسائل پیداوار اور رزق کے سرچشمے نظام اسلامی کی تحویل میں ہوں اور وہاں سے ہر چیز حسب ضرورت افراد معاشرہ میں مساویانہ تقسیم ہو۔ اس طرح کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج نہ ہو اور یہی وہ واحد طریقہ ہے جس سے ایک انسان صحیح معنوں میں خدا کی محکومی اور فرمانبرداری اختیار کرسکتا ہے جس کے لئے اس کو پیدا کیا گیا ہے۔

صبر و استقامت: لیکن پاکستان بننے کے ساتھ ہی، جیسا کہ ہوا کرتا ہے، ایسی جماعتیں بھی پاکستان میں آ گئیں جن کا کام غولِ راہ بن کر اولادِ آدم کو بھٹکانا تھا۔ سب سے بڑی بدنصیبی یہ کہ پاکستان بننے کے ایک سال بعد قائداعظمؒ بھی داغِ مفارقت دے گئے اور اس نوزائیدہ پودے کو ابتدا ہی میں بادِ سموم کی مہلک آندھیوں سے سابقہ پڑ گیا۔ یعنی یکے بعد دیگرے ایسی حکومتیں بنتی رہیں جن کے بنانے والوں کے پیش نظر ذاتی مفاد اور اقربا پروری کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن

قیدِ قفس کے بعد کرے گا قید گلستاں کون گوارا
اب بھی وہی زنجیریں ہیں گو پہلی سی جھنکار نہیں

لیکن طلوع اسلام جس نے حصول پاکستان کی جدوجہد میں کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا تھا، اپنی محنتوں کے ماحصل اور ملت کے مزرعِ شاداب کو اس طرح پامال ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے صبر و استقلال کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اور ایک بار پھر پوری آب و تاب کے ساتھ میدان میں نکل آیا تاکہ پھر سے عوام کو قرآن کے رموز و اسرار سے روشناس کرائے اس مقصد کے تحت پاکستان میں اور پاکستان کے باہر غیر ممالک میں طلوع اسلام کی بزمیں قائم کی گئیں۔ تاکہ ان کی وساطت سے طلوع اسلام کی پیش کردہ فکر کو عام کیا جائے۔ علاوہ ازیں پرویز صاحب کی شبانہ روز محنت کی بدولت عوام کو ایسا لٹریچر ملتا رہا جس کے وہ صدیوں سے منتظر چلے آ رہے تھے۔ سلسلۂ معارف القرآن، مفہوم القرآن، لغات القرآن، سلیم کے نام خطوط، نظام ربوبیت اور وقتاً فوقتاً اشاعت پذیر ہوتے رہنے والی کتب اور پمفلٹوں نے قوم کے جسد مردہ میں نئی روح پھونک دی۔ مذہبی پیشوائیت جو اکاس بیل کی طرح شجرِ ملت کو اپنے شکنجے میں لئے ہوئے تھی، اس کے بل ڈھیلے پڑ گئے۔ ندرتِ فکر اور جدتِ کردار جسے مذہبی پیشوائیت نے بحقِ خود ضبط کر رکھا تھا، عوام کو واپس ملنے لگی اور مسلمان ایک بار پھر تفکر و تدبر کی کشادہ شاہراہ پر دلجمعی سے گامزن ہو گیا۔ یہ قرآن کا اعجاز

تھا اور پرویز صاحب کا درد بھرا دل، جو حقائق کو پا کر چپ نہ رہ سکا۔

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرار کتاب آخر

سلسلۂ نشرواشاعت کی انقلاب انگیز تازہ تصنیف (Islam: A Challenge to Religion)..... ہے جو پرویز صاحب کی عمر بھر کی قرآنی فکر کا انمول شاہکار ہے۔ اس پر کچھ زیادہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ صرف اتنا کہوں گا ؎

ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

حرفِ آخر: طلوع اسلام کا پروگرام ہنگامے برپا کرنا نہیں۔ اس کے پیش نظر نہایت پرامن اور آئینی طریق سے قرآنی فکر کو عام کرنا ہے۔ یہ نہ کوئی مذہبی فرقہ ہے، نہ سیاسی پارٹی اور نہ ہی اس کا مقصد چندے جمع کرنا ہے۔ اگرچہ اس کے پاس سامان و ذرائع کی بے حد کمی ہے پھر بھی یہ اپنی منزل کی طرف بڑی سرعت سے بڑھتے چلا جا رہا ہے۔ طلوع اسلام کے لئے اس سے بڑھ کر اور زادراہ کیا ہوسکتا ہے کہ جب وہ دین کی آواز کو بلند کرتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کائناتی قوتیں اس کا ساتھ دے رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ طلوع اسلام کی آواز نے ہر سننے والے کو متاثر کر دیا ہے اور اس کو رک رک کر سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ کہیں یہ میرے ہی دل کی آواز تو نہیں اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ طلوع اسلام کے ہمنوا تو ایک طرف، اس تحریک کے شدید ترین مخالف بھی اپنے مواعظ اور تقاریر میں خیالات تو کجا، اصطلاحات، استعارات اور اکثر اوقات الفاظ تک بھی وہی استعمال کرتے ہیں جو طلوع اسلام نے قرآن پیش کرتے وقت استعمال کئے ہیں۔ کیا یہ انقلاب عظیم نہیں ہے کہ ؎

حُسن کے رازِ نہاں شرح و بیاں تک پہنچے
آنکھ سے دل میں گئے دل سے زباں تک پہنچے
دل نے آنکھوں سے کہی آنکھ نے ان سے کہہ دی
بات چل نکلی ہے، اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دُعا۔قرآن کی روشنی میں

دَعا کے معنے کسی کو پکارنے اور بلانے کے ہیں۔ چنانچہ الدعاء ۃ۔اس انگلی (سبابہ) کو کہتے ہیں جس سے اشارہ کر کے کسی کو بلایا جائے۔الداعیۃ۔جنگ میں گھوڑوں کی چیخ پکار کو کہتے ہیں۔ھو منی دعوۃ الرجل۔ کے معنے ہیں وہ مجھ سے اتنی دور ہے کہ وہاں تک آدمی کی آواز پہنچ جاتی ہے*۔ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی کو اپنی آواز یا بات سے اپنی طرف مائل کرنا۔

دعاہ الی الامیر۔کے معنے ہیں وہ اسے امیر کی طرف لے گیا۔اس اعتبار سے داعِ صرف بلانے والے ہی کو نہیں کہتے بلکہ اسے بھی کہتے ہیں جو کسی کو کسی دوسرے کی طرف لے جائے*۔ادعاء۔ (یدعون) کے معنے تمنا کرنے کے ہیں*۔یا کسی چیز کو پکار پکار کر بلانے کے (القرآن۔۲۸/ ۶۷)۔

تداعوا علیہ کے معنے ہیں وہ اس کے خلاف جمع ہو گئے۔اور تداعیٰ علیہ العدو من کل جانبٍ کے معنے ہیں دشمن نے ہر طرف سے اس پر حملہ کر دیا۔تداعت الحیطان کے معنے ہیں دیواریں یکے بعد دیگرے گر پڑیں*۔

دعوتہ زیداً۔ میں نے اس کا نام زید رکھ دیا۔الدعیی۔وہ لڑکا جسے متبنی بنا لیا جائے*۔(اس کی جمع ادعیاء ہے القرآن۔۴/۳۳)۔

الداعیۃ۔ اس دودھ کو کہتے ہیں جسے تھنوں میں اس لئے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اس کے سہارے باقی ماندہ دودھ نکالا جا سکے*۔نیز سبب یا باعث۔الدواعی۔ان چیزوں کو کہتے ہیں جو انسان کے جذبات کو ابھار دیں اور اس کے اندر ہیجان پیدا کر دیں**۔(ان معانی کو اچھی طرح پیش نظر رکھنا چاہئے کیونکہ ان سے دعاء کے مفہوم پر روشنی پڑتی ہے)۔

وادعوا شھداء کم (القرآن۔۲/۲۳) کے معنے ہیں تم اپنے مددگاروں کو بلاؤ۔سورۃ کہف میں نادیٰ اور دعا دونوں مرادف معنوں میں استعمال ہوئے

*تاج۔**محیط۔

ہیں (۱۸/۵۲)۔ سورۃ اعراف میں دعا کے مقابل میں صمت کا لفظ آیا ہے (۱۹۳/۷) جس کے معنے چپ رہنے کے ہیں۔ لہٰذا دعا کے معنی پکارنے یا بلانے کے ہوئے۔

سورۃ بقرہ میں ہے: فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ (۶۱/۲)۔ جس کے معنے ہیں ہمارے لئے اپنے پروردگار کو پکار۔ الدعویٰ۔ پکار۔ مطالبہ۔ تقاضا۔ (۱۰/۱۰)۔

اب ہمارے سامنے دعا کا وہ گوشہ آتا ہے جو مذہب اور فلسفہ کی دنیا میں سب سے مشکل مسئلہ سمجھا جاتا ہے اور جس کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے سے طرح طرح کے شکوک اور خدشات لاحق ہو جاتے ہیں۔ یہ گوشہ ہے ''خدا سے دعا مانگنے'' کا۔ ان شکوک وخدشات کو سمجھنے کے لئے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے ایک مثال پر غور کیجئے۔ کسی مقدمہ میں زید مدعی ہے اور بکر مدعا علیہ۔ زید خدا سے دعا کرتا ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ اس کے حق میں ہو جائے۔ اس سے حسب ذیل سوالات سامنے آتے ہیں۔

(الف) ایک گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان کے تمام معاملات کے فیصلے خدا کے ہاں پہلے سے طے شدہ ہوتے ہیں۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیز بھی پہلے سے طے شدہ ہوگی کہ اس مقدمہ میں زید کو شکست ہوگی یا فتح۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ پہلے سے طے شدہ تھا کہ زید کو شکست ہوگی تو کیا زید کے دعا کرنے سے خدا اپنے پہلے فیصلے کو بدل دے گا اور زید مقدمہ ہارنے کے بجائے جیت جائے گا؟ اگر ایسا ہو تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ خدا اپنے فیصلوں کو انسانوں کی مرضی کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ یعنی خدا' انسانوں کی مرضی کے تابع چلتا ہے۔ خدا کے متعلق یہ تصور کسی طرح بھی صحیح نہیں ہوسکتا۔

(ب) فرض کیجئے کہ زید اپنے دعویٰ میں جھوٹا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس کے دعا کرنے سے' خدا مقدمہ کا فیصلہ اس کے حق میں کر دے گا؟ اگر ایسا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا نے جھوٹے کے حق میں فیصلہ کر دیا اور سچے کو اس کے حق سے محروم کر دیا۔ خدا کے متعلق یہ تصور بھی غلط ہے۔

(ج) فرض کیجئے کہ زید اپنے دعویٰ میں سچا ہے۔ اگر زید خدا سے دعا نہ کرے تو کیا مقدمہ کا فیصلہ اس کے حق میں ہوگا یا نہیں؟ اگر دعا کے بغیر فیصلہ اس کی حق میں نہیں ہوسکتا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا از خود سچے کے حق میں فیصلہ نہیں دیتا۔ سچے کو اپنے حق میں فیصلہ لینے کے لئے خدا سے منت خوشامد کرنی پڑتی ہے۔ خدا کے متعلق یہ تصور بھی غلط ہے۔

اور اگر خدا سچے کے حق میں فیصلہ کرتا ہے خواہ وہ دعا کرے یا نہ کرے' تو زید کے دعا کرنے یا نہ کرنے سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ خدا کو بہر حال اس کے حق میں فیصلہ کرنا تھا۔ اس صورت میں دعا ایک بیکار عمل ہوا۔

(د) یہ ظاہر ہے کہ مقدمہ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے انسان کو کوشش کرنی پڑتی ہے۔ ناجائز نہ سہی' جائز

ہی سہی۔کوشش تو ضرور کرنی پڑتی ہے۔اب سوال یہ ہے کہ اگر زید صرف دعا کرے لیکن کوشش نہ کرے تو کیا وہ مقدمہ جیت جائے گا؟ اگر وہ صرف دعا سے مقدمہ جیت جائے تو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے عمل (کوشش کرنے) پر جو اس قدر زور دیا ہے تو وہ سب بیکار ہوگا۔

اور اگر کوشش کے بغیر مقدمہ نہیں جیتا جا سکتا تو پھر دعا کا فائدہ کیا ہوا؟

(س) اگر زید اپنی جگہ خدا سے دعا کرے اور بکر اپنی جگہ۔تو پھر مقدمہ کا فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟ خدا کس کی دعا قبول کرے گا اور کس کی رد کرے گا؟

یہ اور اس قسم کے اور بہت سے شکوک وخدشات ہیں جو دعا کے اس مفہوم سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کے حل کرنے کے لئے مذہب* اور فلسفہ صدیوں سے (ناکام) کوششوں میں مصروف ہیں۔قرآن کریم نے بتایا کہ دعا کا یہ تصور غلط ہے اور اس دور کا پیدا کردہ جب ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا اور کائنات میں قانون اسباب (Law of Causality) کے تصور سے ناآشنا تھا۔اس نے بتایا کہ:

(۱) کائنات میں ہر شے خدا کے لگے بندھے قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے اور خدا اپنے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں کرتا۔وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّـهِ تَبْدِيلاً (۳۳/۶۲)۔''تو قانون خداوندی میں کوئی تبدیلی نہیں پائے گا''۔

(۲) انسانی دنیا میں بھی خدا ہی کا قانون کارفرما ہے۔جو شخص اس قانون کے مطابق جس قدر کوشش کرے گا اسی قدر وہ کامیاب ہوگا۔لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ۝ وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ (۵۳/۳۹-۴۰)۔''انسان کے لئے اس کے سوا کچھ نہیں جس کی وہ کوشش کرے اور اس کی کوشش کا نتیجہ بلاتاخیر سامنے آجائے گا''۔

اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ جو شخص خدا کے قانون کے مطابق کوشش نہیں کرتا اور محض دعا مانگنے سے سمجھتا ہے کہ مقصود حاصل ہو جائے گا' اس کا نہ تو خدا کے متعلق تصور صحیح ہے اور نہ ہی اسے کبھی کامیابی ہو سکتی ہے۔سورۃ رعد میں ہے کہ: دَعْوَةُ الْحَقِّ ۔انسان کی جو دعوت تعمیری نتائج پیدا کر سکتی ہے۔جو حق پر مبنی قرار پا سکتی ہے۔وہ وہی دعوت ہے جو خدا کے لئے (یعنی اس کے قانون کے مطابق) ہو۔وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُم بِشَيْءٍ۔اور جو لوگ خدا کے علاوہ اوروں سے اپنی طلب وابستہ کرتے ہیں۔یعنی چاہتے ہیں کہ خدا کے قانون کو چھوڑ کر' اپنی توہم پرستیوں کے زور پر کامیاب ہو جائیں' تو وہ غلطی پر ہیں۔ان کی یہ خود ساختہ قوتیں ان کی کوئی مانگ پوری نہیں کر سکیں گی۔ایسے لوگوں کی مثال كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ

---

*صفحہ 654

بِبَالِغِهِ۔ ہے' یعنی جیسے کوئی شخص (دریا کے کنارے) اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلا کر بیٹھا رہے (اور دعا کرتا رہے کہ پانی اس کے منہ میں آ جائے تو) اس طرح پانی اس کے منہ تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا' وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِيْنَ إِلَّا فِيْ ضَلَالٍ (۱۳/۱۴)۔ جو لوگ خدا کے قانون سے انکار کرتے ہیں ان کی دعا کبھی نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعاً وَكَرْهاً..... (۱۳/۱۵)۔ کائنات کی ہر شئے' طوعاً وکرھاً' خدا کے قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ سو جب ساری کائنات کا سلسلہ خدا کے قانون کے مطابق چل رہا ہے' تو انسان اس سے مستثنیٰ کس طرح ہوسکتا ہے؟

لہٰذا' قرآن کریم کی رو سے ''خدا سے دعا'' کے معنی ہیں خدا کے قانون سے مدد چاہنا۔ یعنی اس کی اطاعت سے اپنی کوششوں میں صحیح نتائج مرتب کرانا۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے متعدد مقامات پر واضح کر دیا ہے۔ مثلاً سورۃ المؤمن میں ہے: وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِيْ أَسْتَجِبْ لَكُمْ۔ تمہارا نشوونما دینے والا کہتا ہے کہ تم مجھے پکارو۔ میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا (اس کا مفہوم ذرا آگے چل کر بیان کیا جائے گا)۔ اس کے بعد ہے: إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ (۴۰/۶۰)۔ یقیناً جو لوگ میری محکومیت اختیار کرنے سے سرکشی برتتے ہیں' وہ ذلیل وخوار ہوکر جہنم میں داخل ہوتے ہیں۔ آیت کے دونوں ٹکڑوں کے ملانے سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ''خدا کو پکارنے'' سے مراد اس کے احکام وقوانین کی محکومیت اختیار کرنا ہے اور خدا کی طرف سے اس پکار کا جواب ملنے سے مراد انسان کی سعی وکاوش کا ثمر بار ہونا۔ دوسرے مقام پر اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ: إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِيْنَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّداً وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۳۲/۱۵)۔ ہمارے احکام پر ایمان لانے والے وہی لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے وہ احکام پیش کئے جاتے ہیں تو وہ سرِتسلیم خم کر دیتے ہیں اور اپنے نشوونما دینے والے (کے پروگرام کو) درخورِ حمد وستائش بنانے کے لئے سرگرم عمل رہتے ہیں اور وہ ان احکام سے سرتابی نہیں کرتے۔ تَتَجَافَى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفاً وَطَمَعاً وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُوْنَ ینفقون (۱۶۔۱۵/۳۲)۔ وہ ان احکام کی تعمیل میں اس طرح سرگرم عمل رہتے ہیں کہ نیند تک کی بھی پروا نہیں کرتے۔ راتوں کو بھی جاگتے ہیں اور اس طرح اپنے رب کو دفع مضرت اور جلب منفعت کے لئے پکارتے ہیں۔ کیونکہ انہیں علم ہوتا ہے کہ ان احکام کی تعمیل سے کیسے عمدہ نتائج مرتب ہوں گے اور ان کی خلاف ورزی سے کس قدر تباہیاں آئیں گی' جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہوتا ہے وہ اسے (نوع انسانی کی بہبود کے لئے) کھلا رکھتے ہیں۔ سورۃ

المؤمن میں ہے: فَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ..... (۴۰/۶۵)۔ خدا کو پکارو تو اس طرح کہ فرماں پذیری کے ہر گوشے کو خالصتاً اسی کے لئے وقف اور مختص کر دو۔ سورۃ شوریٰ میں ہے: وَيَسْتَجِيبُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ..... (۴۲/۲۶)۔ ''وہ ان کی پکار کا جواب دیتا ہے جو اس کے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے مطابق صلاحیت بخش کام کرتے ہیں''۔ یہاں سے بھی واضح ہے کہ ''پکار اور اس کے جواب'' سے مفہوم کیا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے: ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ (۷/۵۵)۔ ''تم اپنے نشوونما دینے والے کو دل کے پورے جھکاؤ اور سکون سے پکارو۔ اس طرح کہ یہ پکار تمہارے دل کی گہرائیوں سے نکلے۔ یاد رکھو! جو لوگ اس کے قانون سے سرکشی برتتے ہیں اور حد سے تجاوز کر جاتے ہیں، وہ انہیں کبھی پسند نہیں کرتا''۔ اس سے بھی واضح ہے کہ ''خدا کو پکارنے'' سے مراد اس کے احکام کی اطاعت ہے۔ اس سے اگلی آیت نے اسی مفہوم کی تشریح کر دی ہے جہاں کہا ہے: وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوهُ خَوْفاً وَطَمَعاً إِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ (۷/۵۶-۵۷)۔ یعنی تم معاشرہ میں ہمواری پیدا ہو جانے کے بعد ناہمواریاں مت پیدا کرو اور خدا کو دفع مضرت اور جلب منفعت کے لئے پکارو۔ یاد رکھو! جو لوگ حسن کارانہ انداز سے معاشرہ کا توازن قائم رکھتے ہیں، خدا کی رحمت ان سے بہت قریب ہوتی ہے''۔

یہاں ''خدا کی رحمت'' کو قریب کہا ہے۔ سورۃ بقرہ میں خود خدا کے متعلق کہا ہے کہ وہ قریب ہے۔ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ۔ ''اور جب میرے بندے تجھ سے میری بابت پوچھیں تو ان سے کہو کہ میں (کہیں دور نہیں ہوں۔ ان سے بہت) قریب ہوں۔ (ان کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ۵۰/۱۶)۔ میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے''۔ اس کے بعد ہے۔ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ (۲/۱۸۶)۔ ''پس انہیں چاہئے کہ میری فرمانبرداری کریں اور میرے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں۔ تاکہ یہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کا راستہ پالیں''۔

اس سے واضح ہے کہ خدا کو پکارنے (دعا) سے مراد اس کے احکام کی اطاعت ہے۔ اور دعا کا جواب دینے سے مفہوم اس اطاعت پذیری کے نتائج مرتب ہونا۔

سورۃ نمل میں پہلے کائناتی نظام کے مختلف گوشوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ وہاں کس طرح ہر بات خدا کے قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ اس کے بعد، اس جماعت مومنین کو مخاطب کیا گیا ہے جو اپنے نظام کے ابتدائی مراحل میں سخت مصیبتوں اور پریشانیوں سے گذر رہی تھی اور قدم

قدم پر پکار رہی تھی کہ مَتَی نَصْرُ اللّٰہِ (۲/۲۱۴)۔خدا کی نصرت کب آئے گی؟ ان سے کہا کہ أَمَّن یُجِیبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاہُ وَیَکْشِفُ السُّوءَ وَیَجْعَلُکُمْ خُلَفَاء الْأَرْضِ ..... (۲۷/۶۲) (خدا کے علاوہ) وہ کون ہے جو (تمہارے) قلب مضطر کی پکار کا جواب دیتا ہے اور تمہاری پریشانیوں اور مشکلات کو دور کر کے تمہیں استخلاف فی الارض عطا کر سکتا ہے! لیکن یہ استخلاف فی الارض' تمہارے اعمال کے نتیجہ میں مل سکے گا (۲۴/۵۵)۔ اس لئے تم گھبراؤ نہیں۔ خدا کے قانون کے مطابق عمل کرتے جاؤ۔ وہ تمہاری بے کسی اور بے چارگی کو غلبہ و تسلط سے تبدیل کر دے گا۔ اگر تم اس راستے پر چلتے رہے تو ہماری کائناتی قوتیں' ان مخالفین کی ضرر رسانیوں سے تمہاری حفاظت طلب کرتی رہیں گی (۴۰/۷)۔ جماعت مومنین تو ایک طرف' خود حضرات انبیاء کرامؑ سے بھی یہی کہا گیا۔ مثلاً سورۃ یونس میں حضرت موسیٰؑ کے قصہ کو دیکھئے۔ حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ فرعون کا مقابلہ کرنے کے لئے دعائیں مانگتے ہیں۔ اس کے جواب میں ان سے کہا جاتا ہے۔ قَدْ أُجِیبَت دَّعْوَتُکُمَا فَاسْتَقِیمَا (۱۰/۸۹)۔ تم دونوں کی ''دعاء قبول ہوگئی ہے''۔ بس اب تم اپنے پروگرام پر پوری پوری استقامت سے کاربند رہو۔ ظاہر ہے کہ اگر دعاء قبول ہو جانے کا مطلب یہ ہوتا کہ جو کچھ تم نے مانگا ہے وہ تمہیں دے دیا گیا ہے (یا وہ تمہیں مل جائے گا) تو اس کے بعد اس کے لئے کسی کوشش کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن یہاں کہا یہ گیا ہے کہ تمہاری دعاء قبول ہوگئی ہے۔ لہٰذا اب تم نہایت استقامت سے اس پروگرام پر کاربند رہو۔ اس سے واضح ہے کہ جو کچھ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ سے کہا گیا تھا وہ فقط اتنا ہی تھا کہ تمہاری یہ آرزوئیں ہمارے قانون کے مطابق ہیں لہٰذا تم ان کے حصول میں نہایت مستقل مزاجی سے کوشش کرو۔ تم ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے خدا سے دعا کرنے کے معنی اس کے احکام و قوانین کی اطاعت کرنا ہیں۔ اسی ''دعا'' کا حکم رسول اللہ ﷺ کو دیا گیا تھا۔ قُلْ إِنَّمَا أَدْعُو رَبِّی وَلَا أُشْرِکُ بِہِ أَحَداً (۷۲/۲۰)۔ ان سے کہہ دو کہ میں صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس میں کسی اور کو اس کے ساتھ شریک نہیں کرتا۔ یعنی اس کی حاکمیت میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا (۱۸/۲۶)۔

''دعا'' کے اس قرآنی مفہوم کے بعد ان شکوک و خدشات کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

اب ذرا آگے بڑھئے۔ جن باتوں کو ہم اپنی اصطلاح میں ''دعا'' کہتے ہیں' قرآن کریم میں وہ بھی ہیں۔ مثلاً رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِی أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وانصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ

الکافِرِیْنَ (۳/۱۴۶)۔''اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو ہماری کوتاہیوں' اور معاملات میں حد سے بڑھ جانے کے مضر نتائج سے ہماری حفاظت کر۔ ہمارے قدموں کو استقامت عطا فرما اور ہمیں قوم کفار پر کامیابی عطا کر دے''۔یعنی وہ دعائیں جن میں انسان اپنی کسی آرزو کے برآنے کی درخواست کرتا ہے۔ یہ دعائیں درحقیقت انسان کی آرزو کی شدت کا مظاہرہ ہوتی ہیں۔اس شدت آرزو سے انسان کی اپنی ذات میں ایسا تغیر واقع ہوتا ہے جس سے اس کی خفیہ قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں اور مضمر صلاحیتیں بروئے کار آجاتی ہیں۔ان کی وجہ سے اس کا عزم راسخ اور ہمت بلند ہو جاتی ہے اور وہ موانعات کا مقابلہ کرنے اور شدائد پر غلبہ پا لینے کے قابل ہو جاتا ہے۔(الداعیۃ اور الداعی کے جو معنی شروع میں دیئے گئے ہیں۔ان پر غور کیجئے) یعنی سب سے پہلے تو یہ کہ انسان وہی کچھ چاہے جو قانون خداوندی کے مطابق ہو۔ اور پھر اس مقصد کے حصول کے لئے آرزو میں شدت پیدا کرے۔اس سے اس کے اندر ایسی انقلابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتائج حیرت انگیز ہوتے ہیں (واضح رہے کہ قرآن کریم نے یہ بھی کہا ہے کہ تمہاری ہر آرزو' قانون خداوندی کے مطابق ہونی چاہئے' ورنہ تم وہ کچھ طلب کرنے لگ جاؤ گے جو تمہارے لئے درحقیقت مضر ہو گا۔ ۱۱/۱۷)۔ اس حقیقت کو علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تُو بدل جائے

کہا جا سکتا ہے کہ اگر انسان اپنے کسی مقصد کے حصول کے لئے اپنے اندر ویسے ہی شدت آرزو پیدا کر لے تو اس سے بھی اس کی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ پھر اس میں اور خدا سے دعاء کرنے میں کیا فرق ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ اس طرح بھی انسان کی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں لیکن مقصد صرف قوتوں کی بیداری نہیں۔سب سے پہلی چیز خود مقصد کا تعین ہے۔یعنی وہ مقصد ہے کیا جس کے حصول کے لئے آرزو کی جا رہی ہے اور وہ ہے کیسا؟۔ پھر اس کے حصول کے لئے طریقے کیا کیا اختیار کئے جائیں گے اور اس تمام سعی و کاوش کے ماحصل کو کس مصرف میں لایا جائے گا۔ایک ''مردمومن'' (قرآنی انسان) ان تمام امور کا فیصلہ خدا کے احکام کی روشنی میں کرتا ہے اس لئے وہ' پہلے قدم سے آخری قدم تک' خدا کو اپنے سامنے رکھتا ہے۔اس کی طلب و آرزو کی شدت بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہوتی ہے۔اس لئے وہ اس کے لئے بھی خدا ہی کو پکارتا ہے۔خدا کی طرف سے سب کچھ اس کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔حتیٰ کہ دعاء کے نتیجہ میں انسان کی خفیہ قوتوں کی بیداری بھی اس کے قانون ہی کے مطابق ہوتی ہے۔علاوہ بریں' ایک اور بھی نقطہ ہے جس کا سمجھ لینا ضروری ہے۔خدا نے انسانی ذات میں ایسی صلاحیت رکھی ہے کہ وہ مناسب نشوونما سے

اپنے اندر (علیٰ حد بشریت) ان صفات کو اجاگر کرتی جائے جنہیں (لامحدود طور پر) صفات خداوندی یا الاسماء الحسنٰی کہا جاتا ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے خدا کی ذات (یعنی ان صفات کی حامل ذات) انسانی ذات کی نشوونما کے لئے معیار (Standard) بن جاتی ہے۔ انسان کا اپنی شدت آرزو میں خدا کو پکارنے سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اندر ان صفات خداوندی کو اجاگر کرنا چاہتا ہے جن سے مقصد پیش نظر میں کامیابی ہو جائے۔ یہ ہے فرق ''خدا سے دعا مانگنے'' اور اپنے طور پر شدت آرزو پیدا کرنے میں۔

اب رہیں حضرات انبیاء کرامؑ کی وہ ذاتی دعائیں جن کا ذکر قرآن میں ہے۔ سو نبوت کا معاملہ عام انسانی معاملات سے بالکل الگ ہے۔ اس کے متعلق ہم نہ کچھ سمجھ سکتے ہیں نہ سمجھا سکتے ہیں۔ ہم ان کے لائے ہوئے پیغام کو سمجھتے ہیں اور اسی کی اطاعت ہمارا فریضہ ہے۔ باقی رہا ان کی دعاؤں سے یہ نتیجہ نکالنا کہ جس طرح خدا ان کی دعا کے جواب میں ان سے ہم کلام ہوتا تھا' اسی طرح دیگر (غیر از انبیاء) انسانوں سے بھی ہم کلام ہو سکتا ہے۔ تو یہ چیز وحی اور نبوت کے قرآنی تصور کے یکسر خلاف ہے۔ خدا' حضرات انبیاء کرامؑ کے علاوہ کسی انسان سے ہمکلام نہیں ہوتا اور نبی اکرم ﷺ کے بعد ایسا سمجھنا ختم نبوت کی مہر کو توڑنا ہے۔

نہ ہی یہ عقیدہ صحیح ہے کہ خدا ہماری دعا کو نہیں سنتا اس لئے ''خدا کے کسی مقرب'' سے درخواست کی جائے کہ وہ ہمارے لئے خدا سے دعا کرے۔ قرآن کی رو سے خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہو سکتی۔ ایسا سمجھنا شرک ہے۔ ''خدا تک پہنچنے'' یا اس تک اپنی آواز پہنچانے کے لئے کسی ذریعے اور واسطے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر انسان' اس کے قوانین کے اتباع سے ''اس تک پہنچ سکتا ہے'' اور اپنی آواز اس تک پہنچا سکتا ہے۔ اس کے قوانین کا اتباع' قرآنی معاشرہ کے اندر رہ کر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جو دعائیں مومنین کے لئے بتائی ہیں وہ عام طور پر اجتماعی ہیں۔ مثلاً ۷۔۵/۱ و ۲۰۱/۲ و ۲۸۶/۲ و ۷/۳ و ۱۴۶/۳ و ۱۹۲/۳)۔

سورۃ بقرہ کی جو آیت اوپر درج کی گئی ہے۔ یعنی وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ (۱۸۶/۲)۔ ''جب تجھ سے میرے بندے میرے متعلق پوچھیں تو (ان سے کہہ دو کہ) میں قریب ہوں''۔ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (۵۰/۱۶)۔ ''میں انسان سے اس کی رگ جان سے بھی قریب ہوں''۔ تو ان میں ضمناً خدا کے موجود فی الکائنات (Immanence) اور خارج از کائنات (Transcendence) کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔ وہ ہر انسان سے' اس کی رگ جان سے بھی قریب ہے۔ تو اس سے ظاہر ہے کہ خدا کائنات میں ہر جگہ موجود ہے۔ لیکن اس طرح موجود نہیں جس طرح کوئی چیز کسی خاص

مقام میں مقید ہوتی ہے۔ چونکہ ہمارے حواس کسی ایسی شے کا تصور نہیں کر سکتے جو فضا (Space) کے اندر مقید نہ ہو اس لئے ہم اسے سمجھ ہی نہیں سکتے کہ خدا' اس کائنات میں' بغیر جگہ (Space) گھیرے کس طرح موجود ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہہ دیا ہے کہ لَّا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ (۶/۱۰۴)۔ انسانی نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔ لیکن وہ انسانی نگاہوں کا ادراک و احاطہ کئے ہوئے ہے۔ لیکن اس کے قانون کا ہم ادراک بھی کر سکتے ہیں اور نتائج سے اس کا مشاہدہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے ہمارا تعلق خدا کے قانون سے بتایا ہے۔ خود خدا کی ذات سے نہیں۔ دعا (پکارنے) کا تعلق بھی خدا کے قانون سے ہے۔ ہم اس کے قانون کو آواز دیتے ہیں اور جب ہم اس کے مطابق عمل کرتے ہیں تو وہ ان اعمال کے مشہود نتائج کو سامنے لا کر ہماری پکار کا جواب دیتا ہے۔

باقی رہا خدا کا علم' سو جس چیز کو ہم ''ماضی۔ حال۔ مستقبل'' کہتے ہیں' علم خداوندی کی رو سے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ خدا کے سامنے ماضی' حال اور مستقبل سب بیک وقت (Eternal now کی شکل میں) موجود ہوتے ہیں۔ یعنی اسے ہونے والے واقعات کا اس طرح علم ہوتا ہے جیسے وہ سامنے اس وقت ہو رہے ہوں۔ لیکن اس چیز کا ہمارے اس اختیار و ارادے پر کچھ اثر نہیں پڑتا جو ہمیں خدا نے عطا کیا ہے۔ نہ ہی اس بات پر کوئی اثر پڑتا ہے کہ ہمارے لئے جو کچھ ہوتا ہے وہ ہمارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ سب کچھ خدا کے سامنے ہو رہا ہوتا ہے (اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے) لیکن وہ ہمارے اختیار و ارادہ کو سلب نہیں کرتا۔ ہم جو چاہتے ہیں کرتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں اس کا نتیجہ بھگتتے ہیں۔ اگر ہم خدا کے قانون کے مطابق کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ خوشگوار ہوتا ہے۔ اس کے خلاف کرتے ہیں تو نقصان اٹھاتے ہیں۔ کسی میں اس کی طاقت نہیں کہ خدا کے قانون کے خلاف کرے اور اس کا نتیجہ خوشگوار مرتب کرے۔ خدا کے قانون کے مطابق قدم اٹھانا' خدا کو پکارنا یا دعا کرنا ہے اور اس کا خوشگوار نتیجہ مل جانا' دعا کا قبول ہو جانا۔ (ماخوذ از لغات القرآن)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آصف جلیل، کراچی

حضرت انسان قرآن کے آئینے میں

یہ جملہ بہت عام ہے کہ ''انسان اشرف المخلوقات ہے''۔ یہ دعوی بہت بڑی خوش فہمی بلکہ غلط فہمی کی بنا پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے اور وہی سب سے زیادہ اس کے بارے میں جانتا ہے۔ انسان کے دل میں گزرنے والے خیالات بھی اس سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی بات ہی یقینی اور شک وشبہ سے بالاتر ہے کیونکہ وہی انسانوں اور تمام کائنات کا خالق ہے۔ قرآن کریم میں انسانوں کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی روشنی میں انسانوں کا دعویٰ بہت حد تک باطل نظر آتا ہے۔ اس کے مطابق جو شخص جس حد تک قرآنی اقدار کا پابند ہوگا اتنا ہی انسانیت کی بلندی پر ہوگا۔ اس جہت سے انبیاء کرامؑ اور ان کے ساتھی اعلیٰ ترین مراتب پر فائز تھے۔ لیکن جو لوگ اللہ کی ہدایت پر عمل نہیں کرتے جس کے لئے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کا استعمال ضروری ہے تو وہ انسانیت کے پست ترین مقام سے بھی گر کر جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ایسے لوگوں کو اشرف المخلوقات کے زمرے میں شمار کرنا انسانیت کی توہین ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانی ذہنیتوں کے بارے میں بہت سے مقامات پر ذکر کیا ہے۔ مثال کے طور پر جھوٹوں کو لعنت کا حقدار قرار دیا ہے تو ہمارے لئے یہ اطمینان کرنا ضروری ہوگا کہ کہیں ہم جھوٹ کے مرتکب تو نہیں ہو رہے۔ اس طرح کی بہت سی خصلتوں کے بارے جو آیات آئی ہیں انہیں اس کاوش میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس آئینے میں نہ صرف ہر انسان اپنا چہرہ دیکھ سکتا ہے بلکہ دوسروں کے بارے میں بھی جان سکتا ہے۔ انہیں پڑھ کر آپ حیران ہوں گے کہ یہ سب ہمارے جانے پہچانے لوگ ہیں۔ ان سے ہر روز ہمارا واسطہ پڑتا رہتا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں قرآن کریم کی شکل میں ہدایت دی ہے۔ ہمارا ہر قدم اسی کی متعین کردہ راہ کی طرف اٹھنا چاہیے۔ ذیل میں پیش کی جانے والی آیات کا اردو ترجمہ (مولانا) محمد جونا گڑھی کا درج کیا جائے گا۔

☆☆☆

إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُواْ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لاَ يُؤْمِنُونَ (2:6)۔

کافروں کو آپ کا ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے' یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے۔

جب تک انسان کسی عمل کے نتیجے کا انکار کرتا رہتا ہے' یہ ممکن نہیں کہ اس پر کسی قسم کی آگاہی اثر انداز ہو سکے۔ انسانوں کی اکثریت جب تک خود تجربے سے نہ گذرے وہ کسی کے محض بتانے سے باز نہیں آتی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللّهِ وَبِالْيَوْمِ الآخِرِ وَمَا هُم بِمُؤْمِنِيْنَ oيُخَادِعُونَ اللّهَ وَالَّذِيْنَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلاَّ أَنفُسَهُم وَمَا يَشْعُرُونَ (2:8-9)۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں' لیکن درحقیقت وہ ایمان والے نہیں ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کو اور ایمان والوں کو دھوکہ دے رہے ہیں' مگر سمجھتے نہیں۔

یہاں ایک اہم حقیقت بیان کی گئی ہے کہ ایمان کا تعلق زبان سے نہیں ہے۔ انسان کا عمل ثابت کرتا ہے کہ وہ کس بات پر فی الواقع ایمان رکھتا ہے۔ اگر کسی شخص کو ایک لاکھ روپے کی پیشکش کی جائے کہ وہ بجلی کے ننگے تار کو چھو لے تو وہ صاف انکار کر دے گا۔ لیکن وہی شخص ایک ہزار روپے بطور رشوت قبول کر لے گا۔ تو ثابت ہوا کہ اس بات پر تو اس کا ایمان ہے کہ بجلی سے موت واقع ہوتی ہے لیکن اس بات پر ایمان نہیں ہے کہ رشوت اس کی ذات کے لیے نقصان دہ ہے۔ ہماری اکثریت کا آخرت پر ایمان محض زبانی ہے کیونکہ وہ عملاً قرآنی اقدار کی خلاف ورزی کر رہی ہے۔ اس طرح کے زبانی ایمان سے کوئی شخص دوسروں کو نہیں بلکہ خود کو دھوکہ دے رہا ہوتا ہے کیونکہ ہر عمل کا نتیجہ تو خود اس نے بھگتنا ہوگا۔

وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ آمِنُواْ كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُواْ أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاء أَلا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاء وَلَـكِن لاَّ يَعْلَمُونَ oوَإِذَا لَقُواْ الَّذِيْنَ آمَنُواْ قَالُواْ آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْاْ إِلَى شَيَاطِيْنِهِمْ قَالُواْ إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ (2:12-14)۔

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اور لوگوں کی طرح تم بھی ایمان لاؤ تو جواب دیتے ہیں کہ کیا ہم ایسا ایمان لائیں جیسا بیوقوف لائے ہیں' خبردار ہو جاؤ یقیناً یہی بیوقوف ہیں' لیکن جانتے نہیں۔ اور جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان والے ہیں اور جب اپنے بڑوں کے پاس جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں ہم تو ان سے صرف مذاق کرتے ہیں۔

یہاں دو باتوں کا ذکر ہوا ہے۔ ایک یہ کہ خود کو عقلمند اور دوسروں کو بے وقوف سمجھنے کی عام روش بے معنی ہے۔ عقل

انسانی وحی کی رہنمائی کے بغیر بے اثر ہوتی ہے۔ محض عقل کی بنیاد پر انسان دوسروں کے ساتھ معاملات میں عدل سے کام نہیں لے سکتا اور نہ ہی الحق تک پہنچا جا سکتا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کو اپنے رسول بھیجنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ البتہ یہ بات پیش نظر رہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بات منوانے کے لیے عقلی دلائل دیئے ہیں۔ عقل کے بغیر تو کہیں بھی نہیں پہنچا جا سکتا' لیکن صرف عقل سے حقیقت معلوم نہیں ہوسکتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ دو مخالف نظریاتی گروہوں کو یہ یقین دہانی کراتا رہے کہ وہ ان کے ساتھ ہے تاکہ دونوں سے اس کے تعلقات قائم رہیں۔ لیکن قرآن کریم نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ ایسا کرنا محض خود فریبی ہے۔

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ وَأَنتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلاَ تَعْقِلُونَ (2:44)۔

کیا لوگوں کو بھلائیوں کا حکم کرتے ہو؟ اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو باوجودیکہ تم کتاب پڑھتے ہو' کیا اتنی سی بھی تم میں سمجھ نہیں؟

یہ بھی نہایت اہم حقیقت ہے جسے نظر انداز کرنے سے بہت محنت اور وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ کسی بھی مشن کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ اسے لے کر چلنے والے خود اس پر عمل پیرا ہوں۔ ذرا تصور کریں کہ ایک شخص سگریٹ نوشی کے خلاف مہم کی قیادت کر رہا ہو لیکن خود سگریٹ نوشی سے پرہیز نہ کرتا ہو تو اس مہم کی کامیابی کے امکانات کس قدر ہوں گے؟ اس رہنما اصول کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے کہ مزدور ایک سرمایہ دار کو کندھوں پر اٹھائے پھرتے ہیں اس امید پر کہ وہ ان کے دن بدل دے گا۔

قَالُواْ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لاَّ فَارِضٌ وَلاَ بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَلِكَ فَافْعَلُواْ مَا تُؤْمَرونَ oقَالُواْ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاء فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ o قَالُواْ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاء اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ oقَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لاَّ ذَلُولٌ تُثِيرُ الأَرْضَ وَلاَ تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لاَّ شِيَةَ فِيهَا قَالُواْ الآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُواْ يَفْعَلُونَ (2:68-71)۔

مندرجہ بالا آیات حضرت موسیٰ کی قوم سے متعلق ہیں جن میں انہیں گائے ذبح کرنے کی ہدایت کی گئی تھی لیکن وہ طرح طرح کے بہانے بنا رہے تھے۔ یہ واقعہ محض معلومات کے لیے قرآن کریم میں نہیں دیا گیا بلکہ یہ تمام انسانوں کی

رہنمائی کے لیے ہے کہ احکام پر عمل درآمد نہ کرنے کے لیے بہانے نہیں کرنے چاہیے۔ انسانوں کی اس روش کا تجربہ ہم پاکستانیوں کو بہت ہے۔ یہ اس امر کی عکاسی بھی کرتا ہے کہ ہم کس قدر قرآنی احکام پر عمل پیرا ہیں۔

أَفَتَطْمَعُونَ أَن يُؤْمِنُواْ لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلاَمَ اللّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِن بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ oوَإِذَا لَقُواْ الَّذِيْنَ آمَنُواْ قَالُواْ آمَنَّا وَإِذَا خَلاَ بَعْضُهُمْ إِلَىَ بَعْضٍ قَالُواْ أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ اللّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوكُم بِهِ عِندَ رَبِّكُمْ أَفَلاَ تَعْقِلُونَ (2:75-76)۔

(مسلمانو!) کیا تمہاری خواہش ہے کہ یہ لوگ ایماندار بن جائیں' حالانکہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو کلام اللہ کو سن کر' عقل وعلم والے ہوتے ہوئے' پھر بھی بدل ڈالا کرتے ہیں۔ جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو اپنی ایمانداری ظاہر کرتے ہیں' اور جب آپس میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو کیوں وہ باتیں پہنچاتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں سکھائی ہیں' کیا جانتے نہیں کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے پاس تم پر ان کی حجت ہو جائے گی۔

پہلی آیت میں یہ بتایا ہے کہ کچھ لوگ جاننے اور سمجھنے کے باوجود انکار کر دیتے ہیں یا اللہ کے کلام کو بدل ڈالتے ہیں۔ اگر ہم قرآن کریم کو معیار مانتے ہوئے اپنے نظریات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ بہت سی باتوں کو ہم اللہ کے احکام سمجھ کر صحیح سمجھ رہے ہوتے ہیں' باوجود اس کے کہ قرآن کریم میں ان کے بارے میں کوئی ذکر نہیں ہوتا یا اس کے برعکس ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں ہماری خواہش کتنی شدید ہی کیوں نہ ہو کہ وہ ایمان لے آئیں وہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔ دوسری آیت میں دوغلے پن کی ذہنیت کی عکاسی کی گئی ہے جس کے تحت بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جائے جو اپنے خلاف چلی جائے۔ لیکن حقیقت زیادہ دیر تک چھپائی نہیں جا سکتی۔

وَقَالُواْ لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلاَّ أَيَّاماً مَّعْدُودَةً قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِندَ اللّهِ عَهْداً فَلَن يُخْلِفَ اللّهُ عَهْدَهُ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللّهِ مَا لاَ تَعْلَمُونَ (2:80)۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو صرف چند روز جہنم میں رہیں گے' ان سے کہو کہ کیا تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کا کوئی پروانہ ہے؟ اگر ہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کا خلاف نہیں کرے گا بلکہ تم تو اللہ کے ذمے وہ باتیں لگاتے ہو جنہیں تم نہیں جانتے۔

مذہبی پیشوا یہ تصور کر کے کہ یہ آیات یہودیوں کے بارے میں ہیں بہت بڑی خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں۔ لیکن اس طرح کے دعوے تو آج مسلمان بھی کر رہے ہیں۔ ان کے لیے بھی اللہ کا یہی سوال ہے کہ کیا اللہ نے مسلمانوں سے ایسا کوئی وعدہ کر رکھا ہے؟ قرآن کریم میں تو ذکر ہے کہ جو آگ میں جائے گا وہ اس میں ہمیشہ رہے گا۔ کیا سب مسلمان بھی اللہ کے بارے میں خود ساختہ تصورات قائم کیے نہیں بیٹھے؟

ثُمَّ أَنتُمْ هَـؤُلاء تَقْتُلُونَ أَنفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقاً مِّنكُم مِّن دِيَارِهِمْ تَظَاهَرُونَ عَلَيْهِم بِالإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَإِن يَأْتُوكُمْ أُسَارَى تُفَادُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاء مَن يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنكُمْ إِلاَّ خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَى أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (2:85)۔

لیکن پھر بھی تم نے آپس میں قتل کیا اور آپس کے ایک فرقے کو جلاوطن بھی کیا اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ان کے خلاف دوسرے کی طرفداری کی' ہاں جب وہ قیدی ہو کر تمہارے پاس آئے تم تم نے ان کے فدیے دیے لیکن ان کو نکالنا جو تم پر حرام تھا۔ کیا بعض احکام پر ایمان رکھتے ہو اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ تم میں سے جو بھی ایسا کرے' اس کی سزا اس کے سوا کیا ہو کہ دنیا میں رسوائی اور قیامت کے دن سخت عذاب کی مار' اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں۔

اس آیت میں ایک ایسی ذہنیت کے بارے میں ذکر ہے جس میں غلط لوگ اپنے کرتوں کی تلافی کے لیے وہ کچھ کرتے ہیں جو انہیں مذہبی پیشوا بتاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک نظام دیا ہے جس میں سیاست' معیشت اور معاشرت سب شامل ہے لیکن مذہبی پیشواؤں نے اسے مذہب میں تبدیل کر دیا ہے۔ مذہب کو اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ کوئی شخص کن مسائل سے دوچار ہے۔ سرمایہ دار کے لیے مذہب بہت مناسب ہے جو اسے مختلف ذرائع سے بلا روک ٹوک دولت اکھٹی کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اور پھر غریبوں کو خیرات دیتا ہے تاکہ ثواب کمائے۔ یعنی ہر انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اچھی زندگی گزارے۔ غریب لوگوں کا ہونا لازمی ہے تاکہ امیر لوگ ثواب کی خاطر انہیں بھیک دیں۔ یہ بعینہٖ وہی ذہنیت ہے جس کا ذکر آیت میں آیا ہے۔ کہ یہ لوگ پہلے کچھ افراد کو ظلم وستم کر کے ان کے گھروں سے نکال دیتے ہیں اور بعد میں اپنے ثواب کی خاطر انہیں چھڑا کر لاتے ہیں۔

یہاں ایک اور اہم بات کا ذکر آیا ہے کہ تم قرآن کریم کے کچھ حصے پر عمل کرتے اور کچھ کا انکار کرتے ہو۔ مثال کے طور پر وہ آیات جن میں تکریم انسانیت اور ان کو اپنے مال سے بطور حق (خیرات نہیں) دینے کا حکم ہے اور اس طرح کی بہت سی آیات کو جھٹلاتے ہیں۔ ایسا کرنے والوں کو دنیا میں ذلت اور آخرت میں شدید عذاب ہوگا۔ مسلمان دنیا میں جس طرح ذلیل ہو رہے ہیں اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔

قُلْ إِن كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الآخِرَةُ عِندَ اللّهِ خَالِصَةً مِّن دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُاْ الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَادِقِيْنَo وَلَن يَتَمَنَّوْهُ أَبَداً بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ وَاللّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِيْنَo وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيَاةٍ وَمِنَ الَّذِيْنَ أَشْرَكُواْ يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهِ مِنَ الْعَذَابِ أَن يُعَمَّرَ وَاللّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ (2:94-96)۔

آپ کہہ دیجئے کہ اگر آخرت کا گھر صرف تمہارے ہی لئے ہے' اللہ کے نزدیک اور کسی کے لئے نہیں تو آؤ اپنی سچائی کے ثبوت میں موت طلب کرو۔ لیکن اپنی کرتوتوں کو دیکھتے ہوئے کبھی بھی موت نہیں مانگیں گے۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ بلکہ سب سے زیادہ دنیا کی زندگی کا حریص اے نبی آپ انہیں کو پائیں گے۔ ان میں سے تو ہر شخص ایک ایک ہزار سال کی عمر چاہتا ہے' گو یہ عمر دیا جانا بھی انہیں عذاب سے نہیں چھڑا سکتا' اللہ تعالیٰ ان کے کاموں کو بخوبی دیکھ رہا ہے۔

بعض لوگ بزعم خویش خود کو جنتی تصور کیے بیٹھے ہوتے ہیں ان کی خود فریبی کا پردہ اس بات سے چاک ہو جائے گا کہ وہ کس قدر دنیاوی زندگی کی حرص میں مبتلا ہیں اور اس کی خاطر ہر جائز ناجائز ذرائع استعمال کرتے ہیں۔ موت کے تصور سے انہیں خوف آتا ہے حالانکہ اگر کسی کے اعمال بہت اچھے ہوں تو وہ موت سے نہیں ڈرتا کیونکہ وہ زندگی کا اگلا مرحلہ ہے۔ آج کل آپ کو بے شمار لوگ ایسے ملیں گے۔ جو ان آیات کی چلتی پھرتی تشریح ہیں۔

وَقَالُواْ لَن يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلاَّ مَن كَانَ هُوداً أَوْ نَصَارَى تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُواْ بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِيْنَ (2:111)۔

یہ کہتے ہیں کہ جنت میں یہود و نصاریٰ کے سوا اور کوئی نہ جائے گا' یہ صرف ان کی آرزوئیں ہیں' ان سے کہو کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی دلیل تو پیش کرو۔

جنت کے دعوے دار ہر زمانے میں ہوتے ہیں۔ بات اُس وقت کے لوگوں کی ہو رہی ہے لیکن قرآن کریم میں

ابدی ہدایت ہے لہٰذا اگر یہود و نصاریٰ اس طرح کا دعویٰ کرتے تھے تو آج بھی جتنے مذہبی گروہ پیدا ہو رہے ہیں ان پر بھی اس آیت کا اطلاق ہوگا۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ بغیر دلیل کے کوئی بھی دعویٰ بے معنی ہوتا ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَى عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَى شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ (2:113)۔

یہود کہتے ہیں کہ نصرانی حق پر نہیں اور نصرانی کہتے ہیں کہ یہودی حق پر نہیں' حالانکہ یہ سب لوگ تورات پڑھتے ہیں۔ اسی طرح ان ہی جیسی بات بے علم بھی کہتے ہیں۔ قیامت کے دن اللہ ان کے اس اختلاف کا فیصلہ ان کے درمیان کر دے گا۔

یہاں پھر بات اگرچہ یہود و نصاریٰ کی ہو رہی ہے لیکن اس کا اطلاق ہر اس گروہ پر ہوگا جو حق پر ہونے کا دعویدار ہے۔ آج پاکستان میں اسلام کے نام پر بہت سے فرقے وجود میں آ چکے ہیں جن میں سے ہر ایک اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے۔ لیکن ان کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی نے کرنا ہے۔ قیامت کے روز تو وہ خود کر لے گا لیکن اسلامی مملکت کے لیے اس نے بتا دیا ہے کہ " الحق "، صرف قرآن کریم ہی ہے۔ لہٰذا جس کا عمل قرآن کریم کے مطابق ہوگا وہی الحق پر ہوگا باقی سب باطل ہوں گے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

اتباعِ دین کا فطری نتیجہ

سنتِ الٰہی ہمیشہ سے یہی رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانیت کو دین ہی ملتا رہا ہے۔ شروع شروع میں چونکہ معاشرے ابتدائی حالت میں تھے اور ان کے مسائل بھی کم تھے اس لئے راہنمائی خداوندی کی ضرورت بھی کم ہی تھی چنانچہ ان معاشروں کی کفایت کے مطابق ہی ان کو راہنمائی ملتی جاتی تھی۔ لیکن جب معاشرے زیادہ ترقی یافتہ ہونے لگے، اور ان کے مسائل میں بھی اضافہ ہوتا گیا، اسی نسبت سے وحی الٰہی میں بھی راہنمائی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ مشیت الٰہی یہ ہوئی کہ ایک جامع ضابطہ الٰہی نازل کر دیا جائے تاکہ اس کے بعد مزید وحی کے نزول کی ضرورت باقی نہ رہے۔ وحی الٰہی کا مزید نازل نہ کرنا انسانیت کے بالغ ہونے کی دلیل ہے۔ انسانیت کی بلوغت کے دو واضح نتائج ہوئے۔ ایک تو یہ کہ اب انسانیت آزاد ہوگئی کہ اب کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ مجھے اللہ کی طرف سے یہ احکام نازل ہوئے ہیں اور تم میری اطاعت کرو۔ اس طرح اب انسانیت Secure ہوگئی ہے کہ اب اطاعت صرف ان قوانین کی کرنی ہے۔ شخصی اطاعت کا دور ختم ہوگیا۔ شخصی اطاعت نے نظام کی اطاعت کی شکل اختیار کر لی۔ دوسرا سبب نزول وحی کے ختم کرنے کا اور انسانیت کی بلوغت کا یہ ہے کہ اب انسانیت اس قابل ہوگئی کہ وحی کے اصولوں کی جزئیات خود مقرر کرے۔ سابقہ وحی میں ذرا ذرا سی بات کی ہدایت ملتی تھی، لیکن انسانیت کے بالغ ہونے کے بعد وحی میں صرف اصول و اقدار عطا کئے جاتے تھے، کہ اب جزئیات خود نظامِ معاشرہ طے کرے گا۔ یہ انسانیت کے بالغ ہونے کی دوسری دلیل تھی۔

لیکن انسان ہمیشہ وحی میں آمیزش کرتا رہا جس کا نتیجہ ہمیشہ یہ رہا کہ دین مذہب میں بدلتا رہا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین ملتا تھا، لیکن مفاد پرست عناصر اسے ہمیشہ مذہب میں تبدیل کرتے رہے۔ حضورﷺ سے پیشتر تمام انبیاء کو دین ملا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کو بھی دین ملا۔ یہ دین ہمیشہ غالب آتا رہا لیکن ان کے متبعین اس کو مذہب میں بھی بدلتے رہے۔ حضورﷺ سے کافی عرصہ پیشتر سے دین کا کوئی حصہ باقی نہیں رہا تھا کہ حضورﷺ کی بعثت مبارکہ ہوئی اور حضورﷺ نے دین کا نظام پھر قائم فرما دیا۔

مگر وائے برحال ما کہ ہم مسلمانوں نے بھی پھر دین کو چھوڑ کر مذہب ہی اختیار کر لیا لیکن اس فرق کے ساتھ کہ وحی الٰہی انسانی آمیزش سے محفوظ رہی۔ مجموعی حیثیت سے انسانیت نے دین کے نظام سے فوائد حاصل ہی نہیں کئے۔ اسی لئے ہمیں دین کے قیام کے فوائد نظر نہیں آتے۔ ہمارے ہاں تعلیم یافتہ حضرات جس قدر اعتراضات کرتے ہیں وہ سب مذہب پر ہوتے ہیں' دین تو ان کے سامنے ہوتا ہی نہیں۔ اس میں ان کا قصور بھی نہیں ہے۔ ہمارے علماء کرام جو وحی کے متبع ہونے کے مدعی ہیں جب ان کے سامنے ہی دین کا تصور نہیں ہے تو عام Layman کے سامنے دین کا تصور کس طرح آ سکتا ہے۔ ''اتباعِ دین سے دنیاوی مفادات بھی حاصل ہوتے ہیں''۔ یہ ایک ایسا عنوان ہے کہ اس پر ہمارے ایک ہزار سال کے سابقہ لٹریچر میں کسی نے ایک لفظ بھی تحریر نہیں کیا اور نہ کبھی ہمارے علماء مفسرین کے سامنے یہ نظریہ آیا۔ یہ شرف صرف تحریک طلوع اسلام کو حاصل ہے کہ اس تحریک نے اس نکتہ کو اٹھایا۔ قیام پاکستان سے پیشتر بھی علماء کرام کے سامنے اس نکتہ کو رکھا مگر افسوس کہ یہ نکتہ ہمارے علماء کرام کے سر کے اوپر سے ہی گذر گیا۔ وہ اس Point کی Significance کو سمجھ ہی نہیں سکے جس کا ماحصل اس مضمون کا عنوان ہے۔ اس عنوان کی تفصیل قرآنی آیات کی تائید کے ساتھ پیش کی جاتی ہے تا کہ اس موضوع کی وضاحت ہو جائے اور آپ خود اس بات سے Convince ہو جائیں کہ یہ نکتہ صرف طلوع اسلام نے پیش کیا ہے۔

جیسا کہ آپ حضرات کے علم میں ہے ''مذہب'' خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی' نجی' پرائیویٹ تعلق کا نام ہے۔ یہ تعلق انسان اور خدا کے درمیان پرستش (Worship) سے قائم ہوتا ہے۔ اس کے gauge کرنے کا کوئی خارجی معیار نہیں ہے۔ یہ خالص انفرادی Subjective احساس کا نام ہوتا ہے جو ہر شخص کو اسکی مذہبی رسوم ادا کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ ہم مسلمانوں کو مسجد میں جو سکون حاصل ہوتا ہے۔ ہندوؤں کو وہی سکون منادر میں مل جاتا ہے۔ بلکہ خود مسلمانوں میں اس کی مثال واضح ہے۔ جو حضرات قبر پرستی میں ڈوبے ہوئے ہیں' ان کو دربار جا کر' بے حد سکون وطمانیت حاصل ہوتی ہے لیکن جو حضرات قبر پرستی کے منکر ہیں' ان کے لئے پیر صاحب کی قبر صرف مٹی کا ایک ڈھیر ہے وہ اس کے علاوہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ مذہب میں کسی معاشرہ اور کسی حکومت سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہر معاشرہ اور ہر حکومت میں انسان کا براہ راست تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم ہو جاتا ہے۔ لیکن دین کی یہ صورت نہیں ہے۔ دین اس نظام حیات کا نام ہے جس میں انسانوں کے انفرادی و اجتماعی امور کے فیصلے قوانین خداوندی کے مطابق سرانجام پاتے ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس کے لئے مسلمانوں کی ایک الگ مملکت کا ہونا

ضروری ہے۔

مضمون کے عنوان کے ثبوت کو قیام پاکستان سے پیشتر سے شروع کیا جاتا ہے۔ آل انڈیا کانگرس اور اس کی ہمنوائی میں ہمارے علماء کرام کا یہ نظریہ تھا کہ قوم وطن سے بنتی ہے۔ اس لئے ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں' لیکن چونکہ ہندو اکثریت میں تھے اور ہمیشہ اکثریت ہی میں رہے' اس لئے ظاہر ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی حکومت رہتی اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ مسلمان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندوؤں کے غلام اور محکوم بن کر رہتے اور اپنی مذہبی رسوم بھی سابقہ دور کے مطابق ادا کرتے رہتے۔ لیکن اس کے برخلاف قرآنِ کریم کا نظریہ یہ تھا (اور ہے) کہ اشتراک دین قومیت کا معیار ہے' اس کے علاوہ قومیت کی Definition قرآن کے خلاف ہے' ہندوؤں کے نزدیک دوقومی نظریہ کی مخالفت سیاسی نوعیت کی تھی۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک تو دوقومی نظریہ کی حمایت ان کا دینی تقاضہ تھا۔ ان کا دینی تھا کہ انہیں ایک الگ ملک اس لئے ملنا چاہئے تاکہ وہ اس میں اپنا نظام اور اپنا دین قائم کرسکیں۔ اس دینی تقاضہ کو پورا کرنے سے انہیں یہ سیاسی مفاد حاصل ہوتا تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندو کی غلامی سے آزاد ہو کر ایک آزاد ملک میں رہیں۔ اگر ان کے دین کا تقاضہ نظام کا قیام نہ ہوتا' تو وہ آزاد ملک کا مطالبہ نہ کرتے۔ یہ صرف ان کے دین کے تقاضہ کو پورا کرنا تھا کہ ان کو ایک آزاد ملک حاصل ہو۔ اس طرح دین کے اتباع سے ان کو لازم تھا کہ انہیں ایک الگ ملک ملے۔ چنانچہ پاکستان محض اتباع دین کی وجہ سے حاصل ہوا اور اس طرح مسلمانوں کی دنیا دین سے وابستہ ہو جاتی ہے اور دین و دنیا الگ الگ نہیں رہتے یہ نکتہ طلوع اسلام نے نہایت وضاحت کے ساتھ اس دور کے علماء کے سامنے آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی تائید کے ساتھ پیش کیا لیکن افسوس کہ چونکہ اس دور کے علماء دین کے تصور سے عاری اور مذہب کے پجاری تھے وہ اس نکتہ کو Catch نہیں کر سکے۔

قرآن کریم نے جگہ جگہ مسلمانوں کو غالب رہنے کا حکم دیا ہے۔ أَنتُمُ الأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِيْنَ (۳/۱۳۹) اگر تم مومن ہو گئے' تو تم ہی غالب رہو گے۔ وَلَن يَجْعَلَ اللّهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلاً (۴/۱۴۱) اور خدا نے کافروں کو مومنین پر غالب آنے کی کوئی راہ نہیں دی۔ قوت اور حد درجہ قوت فراہم کرنے کا حکم دیا (۸/۶۰)۔ یہ سب امور مسلمانوں کے دین کے تقاضے ہیں مسلمان ان تقاضوں کو جس قدر پورا کریں گے انہیں دنیا میں غلبہ حاصل ہو گا۔ اور اس طرح دنیاوی مقاصد حاصل ہوں گے۔ ارشاد ہوتا ہے وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِّتَكُونُواْ شُهَدَاء عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيْداً (۲/۱۴۳) اور اس طرح تم کو عادل امت بنایا تاکہ تم ساری انسانیت کی نگرانی کرو اور

تمہارا رسول (اور اس کے بعد اس کا جانشین) تمہاری نگرانی کرے۔ اس آیہ کریمہ پر عمل کرنا دین کا تقاضہ ہے اس تقاضے کو پورا کرنے سے دنیاوی مفادات ازخود حاصل ہو جاتے ہیں۔ (۱) تمام مسلمان ایک امت بنے رہیں۔ ان میں آپس میں تفرقہ نہیں ہوسکتا۔ (۲) یہ امت اپنے فائدے کے لئے وجود میں نہیں آتی بلکہ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۳/۱۰۹) تم وہ بہترین قوم ہو جسے انسانیت کی بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ امت دنیا کی ہر قوم کے لئے یکساں فاصلے پر ہوگی اور اس طرح ان سب کی نگران (۳) تیسرا مفاد یہ ہے کہ اس کا مرکزِ ملت خود اس ملت کا نگران رہتا ہے۔ اس آیہ کریمہ پر عمل کرنے اور دین کے اس تقاضہ کو پورا کرنے سے یہ مندرجہ بالا مقاصد و مفادات حاصل ہوتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُم (۸/۲۴) اے ایمان والو اللہ و رسول کی پکار کا جواب دو جب وہ پکارے تا کہ وہ پکار تم کو زندہ کر دے اللہ و رسول کی آواز پر استجابت دین کے فرائض میں شامل ہے اس کے نتیجہ میں مردہ قوم میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو دنیاوی مقاصد میں سے بہترین مقصد ہے۔ سورہ نور میں ارشاد باری ہے کہ ایمان لانے اور اعمال صالحہ کرنے کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہے (۲۴/۵۵) جہاں تک معاشی مفادات کا تعلق ہے، دین کے اتباع سے ہر شخص کو روزی فراہم ہو جاتی ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ کہیں دین کا اتباع کیا جائے اور کوئی شخص بھوکا رہے (۱۱/۶)۔ دین کے اتباع سے معاشرے میں خوف وحزن باقی نہیں رہتا۔ غرض اس بارے میں بے شمار آیات کریمات قرآن کریم میں موجود ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ دین کے اتباع سے نہ صرف آخرت میں سرخروئی حاصل ہوتی ہے بلکہ اس کا نتیجہ اس دنیا میں بھی سیاسی و معاشی مفادات کا حصول ہے۔

ہمارے ہاں جو خالص عبادات شمار کی جاتی ہیں اور جو دین کے ارکان کہے جاتے ہیں، تو ان سے بھی مقصود دنیاوی فلاح و بہبود ہے۔ اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے لئے اقتدار شرط ہے (۲۲/۴) اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا لازمی نتیجہ اقتدار، غلبہ، تمکن وعروج ہے۔ حج اور روزوں کی حکمت کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے لِتُكَبِّرُوا اللّهَ عَلَى مَا هَدَاكُمْ (۲/۱۸۳) حج کے لئے دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ یہ سالانہ اجتماع امت مسلمہ اس لئے قائم کرتی ہے کہ ساری دنیا کے لوگ آ کر یہ دیکھیں کہ مسلمان ان کی منفعت کے لئے کیا کچھ امور سرانجام دے رہے ہیں (۲۲/۲۸)، حج سے مقصود پرستش کی ادائیگی نہیں ہے۔ جہاد تو ہے ہی خاص اس لئے کہ اسکے ذریعے نظام خداوندی کو اس دنیا میں قائم کیا جائے تا کہ ساری دنیا میں سکون اور اطمینان کے حامل معاشرے قائم ہوں۔ غرضیکہ

ان تمام عبادات کا مقصود و منتہیٰ دنیا میں سیاسی و معاشی مفادات کا حصول اور ساری انسانیت کے لئے بہترین معاشروں کا قیام اوران تمام ارکان سے مقصود انسانیت کی خدمت ہے۔

اس کے برخلاف آپ غور فرمائیں کہ کسی بھی ''مذہب'' کے اتباع سے اس دنیا میں فوائد حاصل نہیں ہو سکتے اور نہ ہی اس مذہب کے اتباع سے انسانیت کی خدمت ہوتی ہے۔خود ہمارے ہاں جب دین مذہب میں بدل گیا مندرجہ بالا تمام آیات کی تشریح وتفسیر اس طرح کر دی گئی کہ نہ تو ان سے دنیا کا کوئی تعلق باقی رہا' اور نہ ہی ان کے اتباع سے اس دنیا میں کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح ارکان عبادت کی صورت ہے' ان تمام ارکان کو صرف پرستش میں تبدیل کر دیا گیا اوران ارکان کے ذریعے کسی قسم کی دنیاوی معاشی وسیاسی فوائد حاصل کرنے کا تصور ہی باقی نہیں رہا۔ ہم مسلمان اس معاملہ میں بہت خوش قسمت ہیں کہ ہمارا دین اس درجہ اچھا اور قابل عمل ہے کہ اس کے اتباع سے دنیاوآخرت دونوں میں کامیابی حاصل ہوتی ہے اور یہی اس دین کے وحی الٰہی پر مبنی ہونے اور منجانب اللہ ہونے کی دلیل ہے لیکن یہ سارے فوائد جب ہی حاصل ہوتے ہیں جب ہم قرآن کو بطور دین کے اختیار کریں۔ بطور مذہب کے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ ہماری موجودہ پوزیشن ہے۔

یہ بات خوب ذہن نشین فرمالیں کہ مذہب کا منطقی نتیجہ انفرادی پرستش اور انفرادی نجات کا تصور ہے۔ جب تک ہم مذہب کے انڈر رہیں گے انفرادی پرستش اور انفرادی نجات کا تصور باقی رہے گا۔ مذہب تو ہوتا ہے انفرادیت کا داعی اوراس کا متقاضی اس لئے ہم مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ انفرادی پرستش اورانفرادی نجات کا تصور چھوڑ کر نظام کی اطاعت کو اپنا مطمح نگاہ بنائیں کہ اسی کے اتباع سے دنیاوی مفادات اوراخروی درجات حاصل ہوتے ہیں۔

آخر میں پھرایک بارتحدیث نعمت کے طور پر تحریر ہے کہ اس بارے میں تحریک طلوع اسلام اوراس کے محترم المقام بانی وداعی الی اللہ کو جس درجہ بھی خراج تحسین پیش کیا جائے وہ کم ہے کہ انہوں نے ایک ہزار سال بعد دین و مذہب کا فرق واضح کیا اور یہ نظریہ پیش کیا کہ اتباع دین سے دنیاوی مفادات Buy-Product بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

درود کا قرآنی مفہوم

لفظِ درود! قرآنی یعنی عربی زبان کا لفظ نہیں ہے یہ پہلوی (فارسی) زبان کا لفظ ہے۔ ہمارے ہاں اس کا ترجمہ ''رحمت'' کیا جاتا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے کہ: إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيماً (۳۳/۵۶)۔ ہم یونہی محراب ومنبر یا کسی جلسہ اور محفل میں یہ آیت کریمہ سنتے ہیں تو جیسا کہ ہمیں پڑھایا، بتایا اور سکھایا گیا ہے ہم بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں **اللھم صل علیٰ محمد** ۔ جب ہم یہ الفاظ دہراتے ہیں اس وقت ہمارے ذہنوں میں تراجم اور تعلیم وتربیت کی رو سے مطلب ومقصد یہ ہوتا ہے کہ اے اللہ! محمد ﷺ پر ''رحمت'' بھیج۔ اس کے برعکس اپنے رسول کریم ﷺ کے متعلق اللہ کا ارشاد ہے کہ: وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (۲۱/۱۰۷)۔ ''نہیں بھیجا ہم نے تجھ کو مگر ''رحمت'' واسطے عالموں کے''۔ (ترجمہ از شاہ رفیع الدین)۔ یعنی اللہ کا فرمان ہے کہ اس نے اپنے آخری نبی و رسول کریم ﷺ کو قیامت تک کے لئے تمام نوعِ انسان کے لئے ''رحمت'' بنا کر بھیجا ہے۔ ہم دن رات اے اللہ! محمد ﷺ پر رحمت بھیج کی دعا کرتے نہیں تھکتے اس سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ ہمیں اللہ کی بات (آیت کریمہ) پر یقین ہی نہیں ہے یا پھر دوسری بات یہ ہوسکتی ہے کہ اللہ نے نبی کریم ﷺ کو نامکمل، ادھوری (uncompleted) رحمت بنا کر بھیجا ہے (معاذ اللہ)۔ یہ اس لئے کہ اس کی تکمیل کے لئے ہم مسلمان اللہ سے دعائیں مانگتے رہا کریں تاکہ اللہ میاں خوش ہو کر نیکیوں اور ثواب سے ہماری جھولیاں بھرتا رہے۔ معزز قارئین سوچئے! اللہ نے اپنے حبیب ﷺ کو کتنا بلند مقامِ محمود عطا کیا تھا اور ہم نے انہیں کہاں لا کر کھڑا کر رکھا ہے۔ دینِ اسلام کے صدرِ اول میں جدوجہد کرنے کے ساتھ ساتھ دعاء **اللھم صل علیٰ محمد** سے مفہوم تھا اے اللہ! محمد ﷺ کو دیئے گئے پروگرام، نظام کو پروان چڑھا یعنی اس نظام (دین) کو شرفِ تکمیل عطا کر دے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد جب دین کو مذہب میں تبدیل کر دیا گیا تو پھر دوبارہ دینِ اسلام قائم

کرنے کے بجائے عوام کو تقدیر کا جھانسہ دے کر ان کی خون پسینہ کی کمائی ہوئی دولت پر مکار حکمرانوں' سرمایہ داروں اور مذہبی پیشواؤں نے تن آسودگی اور عیش وعشرت کی زندگیاں بسر کرنے کی خاطر کرنے کے کام کو پڑھنے میں بدل کر ان الفاظ کا مفہوم' اے اللہ! محمد ﷺ پر ''رحمت'' بھیج عام کر دیا۔

سوال یہ ہے کہ مکتبِ مُلّا کے اٹھارہ علوم سے قطع نظر یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِیْماً (۳۳/۵۶) کا لغات القرآن کی رو سے قرآنی مفہوم کیا ہے؟

صلی علیہ۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں۔ تعظیم کرنا' دعا دینا' حوصلہ افزائی کرنا' پروان چڑھانا' نشوونما دینا' کسی قسم کی خرابی یا فساد پیدا نہ ہونے دینا۔

ان معانی کو سامنے رکھنے سے قرآن کریم کے ان مقامات کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جن میں یہ مادہ علیٰ کے صلہ کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً سورۃ احزاب میں جماعتِ مومنین سے کہا گیا ہے هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَمَلَائِکَتُهُ .....(۳۳/۴۳) خدا اور اس کے ملائکہ (کائناتی قوتیں) تمہاری حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ تمہاری نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ تمہاری کوششوں کو پروان چڑھاتے ہیں۔ یہ ان مومنین کے متعلق ہے جن کی بابت دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ جب انہیں اقامتِ دین کے سلسلہ میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ ان سے گھبراتے نہیں' حوصلہ نہیں ہارتے' بلکہ ثابت قدمی سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ أُولَئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ (۲/۱۵۷) یہ لوگ خدا کے نزدیک مستحقِ تبریک وتہنیت ہیں۔ انہیں خدائی تائید ونصرت حاصل ہے۔ خدا ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ان کی کوششوں کو پروان چڑھاتا ہے۔ ان کی نشوونما کرتا ہے۔ یہ تو رہا عام مومنین کے متعلق۔

خود نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہے کہ إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِکَتَهُ یُصَلُّونَ عَلَی النَّبِیِّ ..... (۳۳/۵۶) خدا اور اس کے ملائکہ نبی ﷺ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اس کے پروگرام کو تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ اس کے مشن کو پروان چڑھاتے ہیں۔ اس کے بعد ہے۔ یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِیْماً (۳۳/۵۶)۔ ''اے جماعتِ مومنین! تم بھی اپنے نبی ﷺ کے پروگرام کو کامیاب بنانے میں اس کا ساتھ دو۔ اس کی کوششوں کو پروان چڑھانے میں اس کی مدد کرو۔ اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ اس کی پوری پوری اطاعت کرو''۔ وَسَلِّمُوا تَسْلِیْماً (۴/۶۵)۔ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ (۹/۴۸)۔

(تاکہ) تم اس کی مدد کرو۔ اس کی عزت و توقیر کرو۔ مومنین کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ (۷/۱۵۷)۔ جنہوں نے اس کی تائید وتعظیم کی۔ اس کی مدد کی۔ اس طرح کہ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِيَ أُنزِلَ مَعَهُ (۷/۱۵۷)۔ ''جو روشن (کتاب) ہم نے اس کے ساتھ نازل کی ہے اس کا اتباع کیا''۔ یہ ہے مومنین کی طرف سے **صلوا علیه** کے فریضہ کی ادائیگی کا طریق۔

ان معانی کی رو سے صلی اللہ علیہ وسلم کا مفہوم ہوا۔ اے اللہ! آپ ﷺ کی اطاعت کے ذریعے ہماری کوششوں کو پروان چڑھا۔ چونکہ اطاعت حکمرانوں کے حکم یا احکام کی کی جاتی ہے اس لئے رسول کریم ﷺ کی اطاعت کے لئے آپ ﷺ کے متشکل کردہ نظام کے قائم مقام۔ خلافت علیٰ منہاج رسالت ﷺ۔ دین یا قرآنی نظام کہہ لیجئے کا قائم Establish کرنا لازمی ہے اسکے بغیر اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی لئے قرآن کریم میں **سمعنا واطعنا** کے الفاظ آئے ہیں۔ ترمذی شریف کی حدیث نمبر 3694 میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تمہیں پانچ چیزوں کے کرنے کا حکم دیتا ہوں۔ (1) نظامِ ربوبیت قائم کرو۔ (2) سربراہِ مملکتِ اسلامیہ کی بات سنو (3) اور اس کی اطاعت کرو۔ (4) اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ (5) اگر ملک میں جدوجہد کے باوجود نظامِ خداوندی قائم نہیں کر سکتے تو وہاں سے کسی ایسے مقام کی طرف ہجرت کر جاؤ جہاں قرآنی حکومت قائم کرنے کے لئے حالات سازگار ہوں۔ (ہجرت کے متعلق سورۃ نساء کی آیت 97 میں اللہ کا بھی یہی ارشاد ہے) نیز اسی حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اسلام سے پہلے والے دورِ جاہلیت کے نظام کی طرف پلٹ گیا تو اس کا ٹھکانہ جہنم کی آگ ہوگا۔ بے شک وہ شخص روزے رکھتا ہو۔ نمازیں پڑھتا ہو اور سچا مسلمان ہونے کا اعلان کرتا ہو۔ ''حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے خدائی نظام نہ ہونے کا نتیجہ جہنم اور اس کی آگ فرمایا ہے۔ آگ سے مراد دہکتے ہوئے کوئلے ہی نہیں۔ اس سے مفہوم بغض۔ عداوت۔ حسد اور کینہ بھی ہے۔ یہ اس دنیا کی جہنم کا عذاب ہے جس میں ہم سب گھرے ہوئے ہیں۔ آخرت کا عذاب اس سے کہیں بڑا ہوگا''۔ قرآن میں بھی اللہ کا ارشاد ہے کہ وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الإِسْلاَمِ دِيناً فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِيُ الآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ (3/84)۔ جو فرد یا قوم نظامِ اسلام کے علاوہ زندگی کے لئے کوئی اور نظام اختیار کرنا چاہے تو میزانِ خداوندی میں اس کا کوئی وزن نہیں ہوگا آخرت میں وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوں گے۔ دنیا کے باقی مسلم ممالک کو تو چھوڑیئے پاکستان جو اسلام کے نام سے حاصل کیا گیا تھا اس میں آج تک دینِ اسلام قائم نہیں ہو سکا۔ ملکی حالات پر نگاہ ڈالئے اور سوچئے کہ یہ جہنم اور اس کی آگ نہیں تو اور کیا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آغازِ سخن

علامہ پرویزؒ کی قرآنی خدمات

قارئین کرام اس حقیقت ثابتہ سے بخوبی واقف ہیں کہ قرآنِ حکیم کے سلسلہ میں محترم علامہ غلام احمد پرویزؒ کی زندگی بھر کا سرمایۂ حیات ان کی عظیم کتب ''مفہوم القرآن'' اور ''لغات القرآن'' کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً چالیس پچاس کتب پر مبنی مایہ ناز قرآنی تعلیم پر مشتمل انسائیکلوپیڈیا قرآنِ حکیم کے جاں نثاروں کے لیے علم و شعور کا ایک لازوال سرمایہ تصور کیا جاتا ہے۔

علامہ پرویزؒ کی طرف سے دیے گئے دروس قرآن کی تفصیل

مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ کی مذکورہ بالا شب و روز عرق ریزی کے علاوہ قرآنِ حکیم کو خود قرآنِ حکیم سے سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ان کی طرف سے دروسِ قرآن کا ایک طویل سلسلہ بھی تاحیات جاری رہا۔ چنانچہ ان دروسِ قرآنی کا پہلا دور ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۷ء تک (۸ سال) اور دوسرا دور مارچ ۱۹۶۸ء سے تین اکتوبر ۱۹۸۴ء تک (۱۷ سال) سورہ مطففین تک جاری رہ سکا۔ فکرِ قرآنی کی اس کٹھن منزل تک پہنچنے کے سلسلہ میں محترم پرویز صاحبؒ نے علامہ اقبالؒ کے ساتھ اپنی رفاقت کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا۔

> ''میں اپنے طور پر تو یہی کہوں گا کہ وہ میرے ذاتی محسن ہیں اور قرآنِ حکیم کو سمجھنا میں نے ان سے سیکھا ہے اور پھر یہ کہ انہوںؒ نے ہی ہمیں قرآن حکیم کے نظام سے شناسا کرایا۔''

علامہ پرویزؒ کے دروسِ قرآن کو محفوظ کرنے کی کوشش

عزیزانِ من! محترم پرویز صاحبؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن آڈیو اور ویڈیو کی شکل میں سینکڑوں کی تعداد میں محفوظ کیے جا چکے تھے، چنانچہ اس لازوال علمی خزینہ کی اہمیت کے پیش نظر بزمِ طلوع اسلام لاہور نے انہیں باقاعدہ طور پر

اکتوبر ۲۰۰۳ء سے قرطاس پر منتقل کرنے کا اہتمام کیا لہٰذا اس پروگرام کے تحت اب تک سورۃ نحل سے سورۃ الفرقان اور پارہ ۲۹ اور ۳۰ کے علاوہ سورۃ فاتحہ سمیت بارہ جلدیں قارئین کی خدمت میں پیش کی جا چکی ہیں۔ جب کہ خدا کے فضل و کرم سے اس وقت اسی سلسلہ کی تیرہویں کڑی جو سورۃ شعراء کے دروس پر مشتمل ہے۔ طالبانِ فکرِ قرآن کے استفادہ کے لیے حاضرِ خدمت ہے۔

فہرست میں دیئے گئے عنوانات کے مطابق زیرِ نظر جلد میں دیگر کئی امور کے علاوہ قرآنِ حکیم کی روشنی میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جنسی بدنہادی قوموں کے کریکٹر پر کس قسم کے نقوش مرتب کرتی ہے اور پھر اس بدعملی کے نتائج سے بچنے کا طریق کیا ہے۔

عزیزانِ من! ذاتِ خداوندی نے قدم قدم پر خارجی کائنات کی مثال دیتے ہوئے نوعِ انسانی کو قندیلِ آسمانی میں بڑے واضح انداز میں یہ باور کرا رکھا ہے کہ قوموں کی زندگی میں سب سے بڑا جرم یہ ہوتا ہے کہ قوم تو ہو لیکن وہ عادلانہ نظام سے محروم ہو۔ چنانچہ خالقِ کائنات نے نوعِ انسانی کی برومندی کے لیے قرآنی نظامِ حیات کے بنیادی خدوخال بڑے واضح، سہل اور دوٹوک انداز میں اس نسخۂ کیمیا کے اندر متعین طور پر محفوظ کر رکھے ہیں، یعنی یہ ایک ایسا نظامِ زندگی ہے کہ جس کے تحت انسان پر انسان کی حکومت کی بجائے قانونِ خداوندی کی حکمرانی ہوتی ہے۔ جبکہ اس کے برعکس دورِ ملوکیت میں تو قوموں کی تعلیم و تربیت اور عقل و شعور کی نشوونما کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ نظامِ ملوکیت میں تو محکوم قوم کو اپنا عقیدہ بدلنے کے لیے بھی فرعون کی اجازت حاصل کرنا ہوتی ہے حتیٰ کہ انسانوں کی اس اجارہ داری میں انسان بتدریج اپنی جان بخشی کا ہی طلب گار ہو کر رہ جاتا ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ شعراء میں داستانِ بنی اسرائیل کو بڑی تفصیل سے بیان کرنے کا مقصد انسان کو مذکورہ بالا حقائق سے آگاہ کرنا ہے اور یہ بھی واضح کرنا ہے کہ سرمایہ داری نظام کے دامن میں الجھی ہوئی یہ انسانی زندگی ہمیشہ ایک الم انگیز داستان اپنے اندر لیے ہوئے ہوتی ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج کرۂ ارض پر نظامِ سرمایہ داری کی بارود سے بھری بنیادوں پر استوار ہونے والا یہ فلک بوس Global Village نوعِ انسانی کے لیے ہر سُو ایک جہنم کا نقشہ پیش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ انسانی زندگی کا یہی وہ جہنم ہے جس سے محفوظ رہنے کی خاطر ستر سال پیشتر علامہ اقبالؒ نے قرآنِ حکیم کی روشنی میں اس عقلِ خود بیں کی راہنمائی کرتے ہوئے یہ واضح کیا تھا کہ یاد رکھو!

تدبُّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

لیکن افسوس کہ ہم نے اس دیدہ ور کی اس قرآنی بلند فکری کو ڈھولک کی نذر کرتے ہوئے اسے شاعری کے قبرستان میں دفن کر دیا اور ان کے حیات بخش اور علم وفراست سے مالا مال پیغام کو آگے بڑھنے ہی نہ دیا جب کہ وہ بارگاہِ رسالت میں فریاد کناں رہا کہ

بارگاہِ رسالت ﷺ میں علامہ اقبالؒ کی ایک التجا

من اے میر اممؐ! داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند

(ارمغانِ حجاز)

(اے رسول اکرمؐ! میں تیری بارگاہ میں فریاد کرنے آیا ہوں کہ وہ مجھے شاعر کہہ رہے ہیں، میں شاعر نہیں ہوں ❶۔) ساری عمر وہ یہی چلاتا ہوا مر گیا۔

''وہ اتنا بڑا فلاسفر ہے کہ یورپ اس کا سکہ مان رہا ہے۔ وہ اتنے سے سارے چھ لیکچر نثر میں ان کے سامنے گئے تو یورپ میں ان کے تصورِ اسلامی فکر کی جو انہوں نے قرآنِ کریم سے لیا تھا، وسیع پیمانے پر تشہیر ہوئی۔ قرآن کا اتنا بڑا جاننے والا ہے کہ ہزار برس میں یہ مفکر پہلا بتانے والا ہے کہ اسلام مذہب نہیں دین ہے اور قرآن ضابطۂ حیات ہے۔ یہ ہزار برس میں میری نگاہ میں پہلا شخص ہے جس نے اس طرح بتایا ہے۔ اتنا بڑا انقلابی ہے کہ آپ کو اتنی بڑی مملکت کا تصور دے گیا۔ یہ سب کچھ اس نے کیا لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس کا تعارف صرف شاعرِ مشرق کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ اوہ ستیاناس!! وہ چیختا ہوا مر گیا، وہ ایسا کہنے والوں کو ''مردِ فرودست'' کہہ رہا ہے۔ رسول اللہؐ کی بارگاہ میں جا کے چیخ رہا ہے کہ دیکھنا! یہ مجھ پہ کیا الزام دھر رہے ہیں لیکن قوم نے نہ اسے فلاسفر کہا، نہ اسے مفسرِ قرآن کہا، نہ حکیم کہا، بلکہ شاعرِ مشرق کہا اور ساری دنیا میں شاعرِ مشرق ہے۔ آج اس کا نتیجہ یہ

❶ حضرت علامہ اقبالؒ نے خود سید سلیمان ندوی مرحوم کو ایک خط میں لکھا تھا:

''میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں، جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کیا ہے۔'' (حوالہ طلوعِ اسلام، مئی 1985، ص 63)

ہے' عزیزانِ من! کہ جس قدر انقلابی پروگرام وہ شخص دے کر گیا' وہ سارے کا سارا قوم نے نظر انداز کر دیا' پسِ پشت ڈال دیا اور اس کی وہ چند غزلیں باقی رہ گئیں جو ڈھولک کے اوپر گائی جاتی ہیں اور ریڈیو پہ سنائی جاتی ہیں۔'' (بحوالہ درسِ قرآن حکیم' مورخہ 11 اگست 1978ء)

علامہ اقبالؒ ان ناگفتہ بہ حالات میں بھی قوم سے مایوس نہیں لہٰذا اس صورت حال کے پیش نظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آپ کی شخصیت ہم سے یہ کہہ رہی ہے کہ

نظر آئے گا اسی کو یہ جہانِ دوش و فردا
جسے آ گئی میسر میری سوختہ نظارہ

علامہ اقبالؒ کی شوخیٔ نظارہ قرآنِ کریم کے ماہِ تمام کی مرہونِ منت ہے اور جب یہ روشنی میسر ہو جائے تو سوزِ سخن بھی عینِ حیات بن جاتا ہے اور یہ میسر نہ ہو تو مرگِ دوام انسانیت کا نصیب بن کر رہ جاتی ہے بقول اقبالؒ:

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات
ہو نہ روشن' تو سخن مرگِ دوام اے ساقی!
تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
ترے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی!

آخر میں بزمِ طلوع اسلام لاہور حسبِ سابق محترم ڈاکٹر منظور الحق صاحب کی ان علمی کاوشوں کی دلی طور پر معترف ہے جنہوں نے ان دروس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ آنے والا دور یقیناً ان کی اس جانفشانی کو نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ نیز محترم محمد علی فارق صاحب کی محققانہ علمی کاوش کے بھی معترف ہیں جنہوں نے ان تمام دروس کے ایک ایک لفظ کو بغور دیکھتے ہوئے اپنی علمی راہنمائی کا شرف بخشا۔

علاوہ ازیں آڈیو ویڈیو کیسٹ سے کمپوزنگ کا طویل مرحلہ محترم ہارون ریاض صاحب' رضا اللہ ساجد صاحب اور رشید احمد صدیقی کا رہینِ منت ہے جن کے ہم دلی طور پر احسان مند ہیں۔ والسلام۔

محمد اشرف ظفر
نمائندہ بزمِ طلوع اسلام لاہور۔
17-05-2008

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد سلیم اختر

نقد و نظر

ھاویہ

محترم جمیل احمد عدیل صاحب کا نام قارئینِ طلوع اسلام کے لئے جانا پہچانا ہے۔ان کے مضامین اکثر ماہنامہ طلوع اسلام کے صفحات کی زینت بنتے رہتے ہیں اور قارئینِ طلوع اسلام کے ذوقِ وطلبِ علمی کے لئے بہت سا سامان لئے ہوتے ہیں۔جمیل احمد عدیل صاحب کی اس سے قبل قریباً 14 عدد تصنیفات مختلف اصنافِ ادب میں زیورطباعت سے آراستہ ہوکر منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔تازہ ترتصنیف ''ھاویہ'' ان کے تازہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ کتاب کے پہلے اندرونی فلیپ پر اردو ادب کے معروف استاد ڈاکٹر انوار احمد صاحب کی رائے چھپی ہوئی ہے' ان کے بقول:

> جمیل احمد عدیل کئی اعتبار سے انوکھا کہانی کار ہے' فلسفہ' تصوف اور مفرس انشاء پردازی اس کی قوت بن سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔''

ہمیں ڈاکٹر انوار احمد صاحب کی جمیل احمد عدیل صاحب سے متعلق رائے سے اتفاق ہے لیکن تصوف کو ان کی کمزوری یا قوت بتانا قرینِ انصاف نظر نہیں آتا۔ڈاکٹر انوار صاحب کی تصوف سے مراد اگر وحیِ الٰہی اور اس کا آخری مظہر' قرآنِ کریم ہے تو ان کی رائے کو تسلیم کیا جا سکتا ہے۔افسانوں کے زیرِ نظر مجموعے کا نام ''ھاویہ'' ہی اس بات کی غمازی کے لئے کافی ہے کہ افسانہ نگار کا قرآنِ کریم سے تمسک اور لگاؤ غیر معمولی ہے۔راقم نے اس مجموعے میں شامل ایک افسانہ ''آرزو'' پڑھا تو گریہ کرنے سے اپنے آپ کو روک نہ سکا اور کئی دن اس کے زیر اثر رہا۔امید ہے جمیل احمد عدیل صاحب آئندہ قارئینِ طلوع اسلام کے لئے اپنے افسانے بھی عنایت کیا کریں گے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''ھاویہ'' بہت اچھے گٹ اَپ میں شائع ہوا ہے۔206 صفحات پر مشتمل اس مجموعہ کی قیمت -/200 روپے ہے اور پورب اکادمی' اسلام آباد نے

اسے شائع کیا ہے۔

کمالِ طُور

محترم محمد صدیق بن اللہ دِتہ پُرانے عاشقِ قرآن ہیں اور اپنے جذبات کو اپنے انداز میں شعر کی صورت دیتے رہتے ہیں۔ ان کی نظموں کی بڑی خصوصیت سادگی اور تاثیر ہے۔ ان کے کلام کے انتخاب پر مشتمل ایک مجموعہ بہت خوبصورت انداز میں شائع ہوا ہے۔ چھپائی اور کاغذ بہت اعلیٰ درجہ کا استعمال ہوا ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ دیونہ منڈی، گجرات سے بلا قیمت دستیاب ہے۔

قرآنی اور روایتی دین کے فاصلے

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی کا نامِ نامی محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ موصوف کے بیسیوں مضامین میں سے صرف سات عدد مختصر مضامین کو ایک کتابچہ کی شکل میں درجِ بالا عنوان کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ مصنف موصوف کے اسلوبِ تحریر سے تو قارئینِ کرام خُوب واقف ہیں۔ کتابچہ زیرِ تبصرہ میں شامل مضامین میں سے کئی ''طلوع اسلام'' میں شائع ہو چکے ہیں۔ صِرف سات مختصر مضامین کے فاضل مرتب کو مصنف سے شکوہ ہے کہ ان میں تکرار (Repitition) ہے اور اس کے لئے انہوں نے قارئین سے معذرت بھی طلب کی ہے۔ کتابچے کا کاغذ اور چھپائی معمولی درجے کی ہے اور پروف ریڈنگ اور املاء کی غلطیاں خصوصاً فارسی اشعار میں، باذوق قاری کے لئے تکدر اور تکلیف کا باعث بن سکتی ہیں۔

POINT OF VIEW

SAY ALLAH NO GOD

By

Abdul Rashid Samnakay

The underlying theme in 'Say Allah no God' is, in real sense, a semantic issue that pertains to 'meaning in language'. Its area is Science of Semantics', which is 'study of meaning in language forms, particularly its historical change(s). It covers relationship between 'Signs and Symbols and what they represent i.e., the subtleties in meanings.

This issue, raised/pin-pointed in this brief note, demands writing up of an independent article on 'Science of Meaning in Language Forms'. I am sanguine Mr. Abdul Rashid Samnakay will be able to write such a comprehensive essay that will cover the issue he has pin pointed. This will help many readers understand how significant is the 'Science of Words' that implicitly or explicitly is related to the concept of the life of a nation and encompasses its cultural mores and cores emotionally kept very near and dear to its individuals. (Idara)

In the January 2008 Tolu-e-Islam an Urdu article appeared to give a message along with other important issues, that it is not appropriate to substitute the word GOD for Allah, when writing in the English language. This is because the word God does not convey the same meaning of *lailahaa-illallah* as that of "*except for Khuda there is no such being which has the right of authority*" and therefore it should be written as "*there is no Sovereign except Allah*"

Commonly in English language the word God is given to mean 'the supreme being' and 'the supreme Creator of monotheistic faiths' etc. Now if we insist that when referring to God we must write Allah as if this name is registered in some Arabic government's Birth and Death registry and that it has issued a birth certificate to that effect!

This gives the impression not only that this 'being' is for Muslims but specifically it is a monopoly of the Arabs nation and the other Muslims adopted HIM to qualify to be termed as Muslims. This can be extended to many other traditions and practices of Arabs, such as their dress mode, copied by others to project themselves as 'good Muslims' or 'complete

Muslims' particularly on return from hajj. It becomes that Allah is NOT therefore a universal supreme being for the whole Creation. This gives rise to a comical situation when others say that your God is not the same as ours. Your Allah is different!

Quran tells us that divine messengers had come in all ages, places and time periods prior to Muhammad (PBUH). It stands to reason therefore that they spoke myriads of languages and conveyed the concept of a supreme being and transmission of HIS message in their own language, as in Quran by combining the two words *al* and *ilah* according to the rules that it became Allah (17:22). What is more is that the word Allah was already in vogue then, it was not manufactured for Arabic speaking by Rasulullah.

There was not then and is not now an international common language in which a compound word could be used to give the full meaning of Allah as "*the only supreme creator of the universe with total authority and control over HIS creation".* In English language by using the word God, if an elaboration is required then there is no logical reason that such an elaboration could not be given. This attitude towards other people and their language smacks of linguistic racism that, they do not posses the true concept of GOD accept today's Muslims!

The writer of the Urdu article goes on to use the word *Khuda* twenty five(25) times in it, not counting the attribute *khudawandi* which are repeated number of times, because he assumes that the word *Khuda* in Urdu imparts the meaning completely, which as we know is not true.

This issue is raised to highlight the broadness of the Deen Islam and its acceptance of other Faiths as worthy of respect and consideration in the Universality of humanity in conjunction of HIS Unity.

==========

Anita Roddick gives £51 Million in charity

Anita Rodidck, the late founder of the world famous cosmetic Body Shop empire of England,fulfilled her promise that she would not leave one penny of her multimillion-pound fortune to her children in her will.

She gave £51 million to her charitable foundation before she died last year aged 64.

Anita once described the idea of bequeathing her fortune to her children as obscene. " I told my kids that they would not inherit one penny," she said. " The money that we make from the company goes into the Body Shop foundation which supports charities like Greenpeace and Amnesty International.

Her two daughters, Sam and Justine said they supported their mother's decision to disinherit them. Sam who is 35, said " If my mum had said to me 'I'm not leaving any money to you but I've decided to give it all to a distant cousin' , then I would have found that offensive. But giving it all to charity is different. You cannot argue about someone giving their money away, can you? She had already given us everything in terms of love and support.

Anita was told in 2004 that she had hepatitis C, contracted through a blood transfusion when she gave birth to Sam in 1971. She was suffering from cirrhosis of the liver. In 2005 L'Oreal, the French cosmetics giant bought Body Shop for £625 million.

Money does not mean anything to me." she said once. " The worst thing is greed **--** the accumulation of money"

(Abridged news taken from *The Times of London,* of 17 April , 2008 issue.)

Anita was not a Muslim. She never read Quran but she proved to be more nearer to Quranic ideology than we the so called followers of Islam.

She really set a salutary practical example of 'giving everything surplus to our needs to others' (Sura 2 verse 219) (M.M.Farhat)

==========